JULY
2021

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

Use Mask
Stay Safe

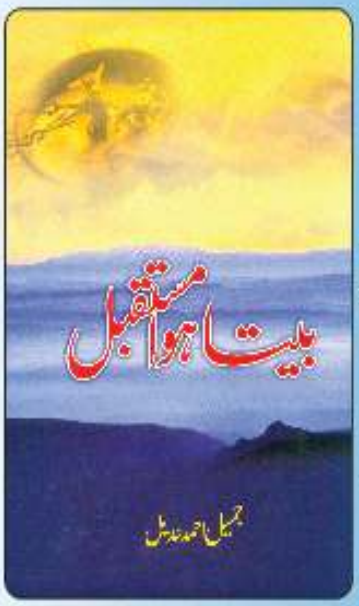

(مجموعہ غزلیات)
ستارے
اور
شرارے
عثمان قیصر

بیتا ہوا مستقبل

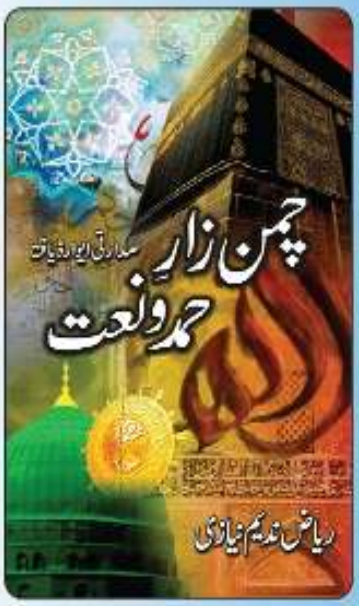

ارشد علی
زمین زاد

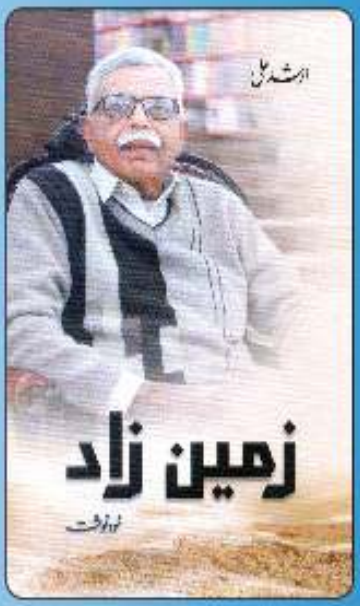

چمن زارِ
حمد و نعت
ریاض ندیم نیازی

ہمّی

صُبح سفر ، شام سفر
صُبح کہیں ، شام کہیں
راہ گزر ، راہ گزر
ایک نہیں ، نام کہیں
کوئی ملے ، کام کہیں
گاؤں سہی ، شہر سہی
نان کہیں ، جام کہیں
کچھ تو مِلے ، زہر سہی
آئے تو کچھ ، قہر سہی
کچھ نہ چلے ، جنگ چلے
آؤ نئی ، لہر سہی
چنگ چلے ، بھنک چلے
چھاؤں بھی دیں ، دھوپ تو ہو
رنگ بھریں ، روپ تو ہو

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 Lahore: (042) 36363300-7
Sialkot: (052) 3554301-6 Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 Peshawar: (091) 5606565 Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شارح

ماہنامہ

بیاض

لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 29 - جولائی 2021 - شمارہ نمبر: 7

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد — کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: حج اور عید الاضحیٰ مبارک — قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور - 53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے زیب ایڈ ملٹی پرنٹرز 16 کلو میٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، سرور حسین نقشبندی	7 تا 9
2	نعت	اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی، محمد یٰسین قمر، اکرم ناصر، ارشاد نیازی	10 تا 14
3	عقیدت	مظہر حسین مظہر، خاور اعجاز، سرور حسین نقشبندی	15 تا 18
4	رباعیات	شوکت محمود شوکت	19
5	قطعات	نسیم سحر	20
6	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	21 تا 26
7	رفتگاں	جلیل عالی	27 تا 36
8	تہذیب کا قرآنی مطالعہ	سیدہ آیت گیلانی	37 تا 42
9	افسانے	اسلام عظمی، کلیم خارجی، تہنیت رباب	43 تا 70
10	یادیں	رخشندہ نوید	71 تا 80
11	مائیکروفکشن	حامد یزدانی، سلمان یوسف سمیجہ، فیصل القدوسی، عمار نعیمی	81 تا 88
12	شاعرِ امروز	فضل گیلانی، مقداد احسن [شاہد ماکلی]	89 تا 95

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
13	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، حسن عسکری کاظمی، جمیل یوسف، نسیم سحر، راحت سرحدی، صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، رشید آفرین، باقی احمد پوری، سعد اللہ شاہ، عقیل رحمانی، اکرم ناصر، سید ضیا حسین، ممتاز راشد لاہوری، یعقوب پرواز، حامد یزدانی، اعجاز روشن، شبہ طراز، احمد جلیل، ثمینہ سید، شوکت محمود شوکت، محمد نوید مرزا، اکرم سحر فارانی، علی حسین عابدی، طلعت شبیر، افتخار شاہد، حسنین سحر، اشفاق ناصر، طالب انصاری، ہارون الرشید، اشرف کمال، ریاض شاہد، شاہد ماکلی، اقبال سروب، سید تحسین گیلانی، ارشد محمود ارشد، انصر حسن، شہزاد احمد شیخ، وسیم جہران، تاثیر نقوی، زبیر فاروق، بشیر احمد حبیب، ثاقب تبسم ثاقب، ارشد شاہین، اکرم جاذب، حکیم خان حکیم، ساجد رضا خان، رفعت وحید، امر مبکی، صغیر احمد صغیر، عزم الحسنین عزمی، عاصم اعجاز، اخلاق اکرم، عاطف جاوید عاطف، حمزہ یعقوب، رابعہ عبدالقیوم، سرور فرحان، امتیاز انجم، فرح شاہد، عقیل شانی، عطاء العزیز، لبنیٰ مقبول، نائلہ راٹھور، رمیض نقوی، توقیر احمد، رخسانہ سمن، اعجاز رضوی	96 تا 167
14	آبیتی	شوکت علی شاہ	168 تا 177
15	مضامین	سید ریاض حسین زیدی، رضا علی عابدی، آفتاب احمد ملک، ناصر ملک، عامر رضوی، سرور حسین نقشبندی، جام سجاد حسین، نور کمال شاہ، درخشاں انجم (کولکتہ) گل اکبر، افتخار ساحل	178 تا 214
16	طنز و مزاح / خاکے	سیدہ آمنہ ریاض	215 تا 216
17	نظمیں	خالد احمد، امجد اسلام امجد، حسن عسکری کاظمی، فرحت پروین، حامد یزدانی، رخشندہ نوید، طلعت شبیر، اقبال سروب، امجد بابر، امین کھجاہی، حکیم خان حکیم، نائلہ راٹھور، افتخار بیگ، رخسانہ سمن	217 تا 233
18	خطوط	آصف ثاقب، جمیل یوسف، طالب انصاری، ثاقب تبسم ثاقب، رانا محمد شاہد، اشرف کمال	234 تا 241

حمد

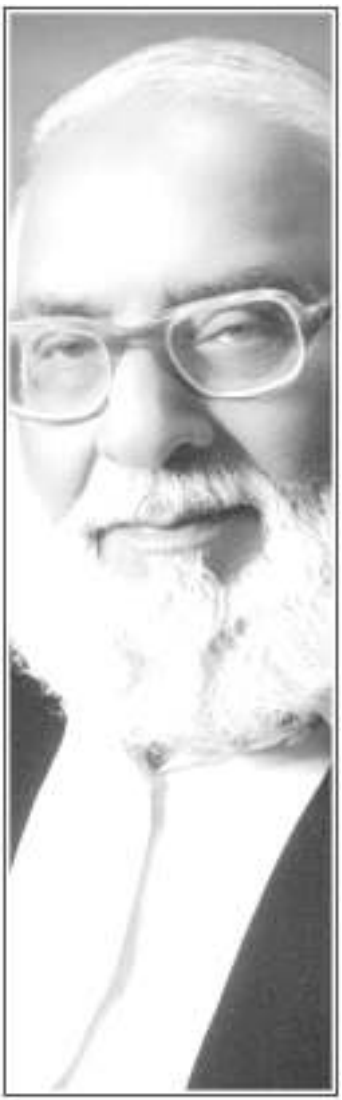

کن فکاں کے کمال نظارے
کیا سے کیا اس نے روپ ہیں دھارے

ہے وہ موت و حیات کا خالق
زندہ رکھے کسی کو یا مارے

فرش کو آسمان کرتا ہے
آسماں کو زمیں پہ دے مارے

کائناتیں ہیں اس کی ہی تصنیف
اور قرآں کے سارے سیپارے

ہمت افزا عطائیں ہیں اس کی
اس کے دریوزہ گر نہیں ہارے

تیرگی سے جو تنگ تھیں راتیں
اس نے ٹانکے ہیں رات کو تارے

میں دعا گو ریاضؔ ہوں ہر دم
اس کے بندے بنے رہیں سارے

سید ریاض حسین زیدی

حمد

نسیمِ سحر

ہر شعبۂ حیات میں موجود حمد ہے
اِس ساری کائنات میں موجود حمد ہے

موضوع وہ حیات کے ہوں یا ممات کے
اِن سب معاملات میں موجود حمد ہے

جب اس کی کبریائی کا چھڑ جائے تذکرہ
پھر تو ہر ایک بات میں موجود حمد ہے

دستِ دُعا اُٹھا کے کریں جو مکالمات
ان سب مکالمات میں موجود حمد ہے

فطرت کے چار سُو جو نظارے ہیں رُوبرُو
اُن کے مشاہدات میں موجود حمد ہے

ہر سانس اس کی بخشی ہوئی ہے ہمیں نسیمؔ
ہر لمحۂ حیات میں موجود حمد ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وسعتِ کائناتِ عشق دکھا
ربِّ قوسین! نقطۂ پرکار

حمد

گلوں میں حسن، ادائیں کہاں سے آتی ہیں
یہ خوشبوئیں، یہ ہوائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ سبز رنگ کی چادر بچھائی ہے کس نے
یہ رنگ رنگ قبائیں کہاں سے آتی ہیں

فلک پہ کون ستاروں کو ٹانک دیتا ہے
یہ تیرگی میں ضیائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ پانیوں کو اڑاتا ہے بادلوں میں کون
پھر آسماں پہ گھٹائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ کون اپنی طرف کھینچتا ہے مشکلوں میں
لبوں پہ سب کے دعائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ کون ہم کو جگاتا ہے شب کے پچھلے پہر
نفس نفس یہ صدائیں کہاں سے آتی ہیں

سکھاتا کون ہے تسبیح سب پرندوں کو
یہ ذکر پوش نوائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ جنگلوں میں اگاتا ہے کون سبزہ و گل
یہاں چمن کی صبائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ حرف کون سجھاتا ہے حمد کہنے کو
خیال و فن پہ عطائیں کہاں سے آتی ہیں

اگر خدا نہیں دیتا تو پھر بتائے کوئی
ہمارے تن میں شفائیں کہاں سے آتی ہیں

بھلا کے اس کو زمانے سے پوچھتے ہیں ہم
پتا نہیں یہ بلائیں کہاں سے آتی ہیں

یہ کیسے کھلتے ہیں سرورؔ گلاب شاخوں پر
یہ شبنمی سی ردائیں کہاں سے آتی ہیں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

نبیؐ کی بات کرنا چاہتا ہوں تشنگان سے
حروفِ ضوفشاں آئیں اتر کر آسماں سے

نبیؐ جی واسطہ مہرِ نبوت کا نبیؐ جی
نبیؐ جی ہم نکالے جا رہے ہیں داستاں سے

نبیؐ جی آپ نے تو دشمنوں کی خیر چاہی
ادھر بھی برکتیں اُٹھنے لگی ہیں درمیاں سے

نبیؐ جی اُن پہ بھی اپنا کرم ، فرمایئے گا
گزارے جا رہے ہیں جو مسلسل امتحاں سے

مرے آقاؐ کبھی میری زباں میں بات کیجیے
کوئی لغزش نہ ہو جائے کہیں پر ترجماں سے

نبیؐ کا واسطہ دیتے ہوئے کیسے لگیں گے
مرے بچے دعائیں مانگتے اللہ میاں سے

کنورؔ جی آج بھی سجدہ کریں وہ آدمی کو
عمل میں معتبر ٹھہرے اگر کردیاں سے

اعجاز کنور راجہ

نعتؐ

آپؐ کا جو بھی ہوا اس پہ کرم ہوتا ہے
آپؐ کے فیض سے دل اس کا حرم ہوتا ہے

جس کا ایمان ہے پختہ تو حضورؐ اس کے ہیں
ساری دنیا میں بڑا اس کا بھرم ہوتا ہے

آپؐ کے حلقہ بگوشوں کا خدا سے ناطہ
سرنگوں آپؐ کے اعدا کا علم ہوتا ہے

مدحتِ سرورِ کونینؐ میں جو بھی اٹھے
معرکہ خیز وہی سیف و قلم ہوتا ہے

منحرف جو بھی ہوئے آپؐ سے میرے آقاؐ
دیکھ کے ان کو بڑا رنج و الم ہوتا ہے

رتبہ انساں کو ملا آپؐ کے دم سے جو بھی
قابلِ رشک وہی جاہ و حشم ہوتا ہے

نعت کا شعر ہوا جب بھی ادا مجھ سے ریاضؔ
اس کا ہر حرف ثنا دل پہ رقم ہوتا ہے

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

اُنؐ کی مدح و ثنا نصیب میں ہے
نعمتِ بے بہا نصیب میں ہے

اسمِ احمدؐ وظیفہ ہے جب سے
شہد کا ذائقہ نصیب میں ہے

سارے رستے مدینے جاتے ہیں
آپؐ کا نقشِ پا نصیب میں ہے

اب مرے چارسُو اجالے ہیں
نعت کا رتجگا نصیب میں ہے

شکر واجب ہے اے دلِ مضطر
حُبِّ خیرالوریٰؐ نصیب میں ہے

سیرتِ پاک ہے خیالوں میں
نور کا سلسلہ نصیب میں ہے

اب پڑاؤ ہیں کہکشاؤں میں
آپؐ کا راستہ نصیب میں ہے

میں ہوں نازاں قمر مقدر پر
خاکِ در کی ضیا نصیب میں ہے

محمد یٰسین قمر

نعتؐ

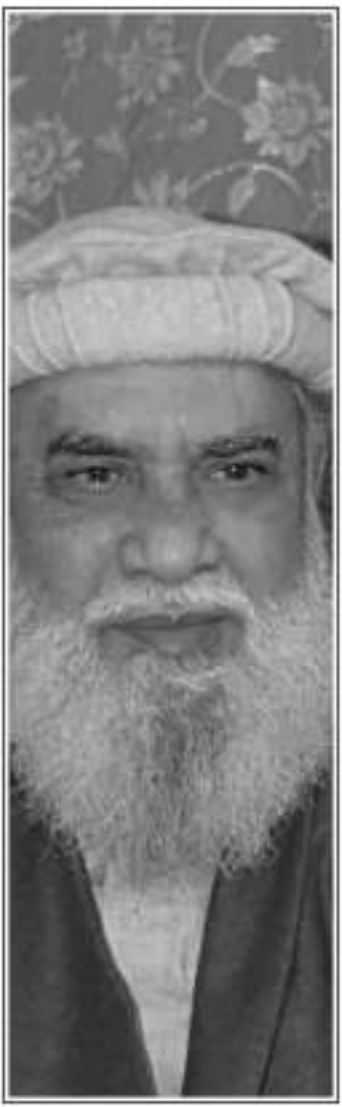

ہر شخص کے بس میں نہیں ہر بات کا کہنا
اور نعت کا کہنا تو ہے پھر نعت کا کہنا

اعزاز سا اعزاز ہے اعزاز سا اعزاز
کیا ان کی سرِ عرش ملاقات کا کہنا

ہر سمت نظر آئے رفعنا لک ذکرک
یونہی تو نہ تھا رب سماوات کا کہنا

سر آنکھوں پہ رکھتا ہوں میں اولادِ پیمبر
سر آنکھوں پہ رکھتا ہوں میں سادات کا کہنا

جانا ہو مدینہ تو اے خوش بخت ہواؤ
آقا سے مرے ملک کے حالات کا کہنا

کہنا کہ کرم کی ہو نظر آقا و مولا
رحمت کی مرے گھر میں بھی برسات کا کہنا

جس ذات کا ہر حکم بجالائے ہر اک شے
میں نعت کہوں مان کے اس ذات کا کہنا

اکرم ناصر

نعتؐ

اک نعت رنگِ حمد میں محمود کے لیے
لکھی خدائے غیب نے موجود کے لیے

اُمت کو اس مقام پہ لائے ہیں مصطفےٰ
سجدہ ہے جس یقین پہ مسجود کے لیے

جب سے خدا ہے تب سے محمد کی ذات ہے
عابد کوئی تو چاہیے معبود کے لیے

سب پر تھی ثبت مہرِ جبینِ شہِ انام
جتنی شہادتیں ملیں مشہود کے لیے

معراج ہے سند کہ خدا کھولتا نہیں
قوسین کی حدیں کسی محدود کے لیے

لطفِ شہا کہ پائی کلیدِ درودِ پاک
در مل گیا مجھے رہِ مسدود کے لیے

ارشاؔد یوں مہکتا ہے عشقِ نبی سے دل
جیسے ہو کوئی آنچ کسی عود کے لیے

ارشاد نیازی

اسماالحسنیٰ.....اللہ پاک کے ننانوے نام (منظوم صورت میں)

وہ اللہ معبود پروردگار — وہ تواب متعال ہادی بھی ہے
اسی کا ہے حکم اور سب اختیار — رؤف اور باسط ہے مغنی بھی ہے

وہ حاجت روا اور مشکل کشا — بدیع اور وارث ہے باقی بھی ہے
وہ سارے جہانوں کا فرماں روا — وہ خالق مصور ہے باری بھی ہے

وہ رحمٰن ہے اور وہی ہے الہ — وہ سب سے عظیم اور سب سے کبیر
وہ سب بادشاہوں کا ہے بادشاہ — وہی سب کا ناصر وہی ہے نصیر

وہ اول بھی ہے اور آخر بھی ہے — وہ غفار قہار قابض بھی ہے
وہ باطن بھی ہے اور ظاہر بھی ہے — وہ فتاح مومن ہے خافض بھی ہے

وہی ہے سمیع اور وہی ہے بصیر — وہ قدوس ہے اور جامع بھی ہے
وہی ہے علیم اور وہی ہے خبیر — وہ مقسط وہ مانع وہ نافع بھی ہے

وہ ماجد ہے واحد ہے اور ہے احد — وہی ہے لطیف اور وہی ہے جلیل
وہ ہے مقتدر اور قادر صمد — عزیز و مہیمن وہ رافع خلیل

وہی مغنی ہے اور وہی ہے غنی
اسی ایک باعث سے ہر شے بنی

وہ ہے منتقم اور اعلیٰ حکیم
نہیں اس سے بڑھ کر کوئی بھی حلیم

قوی و متین و ممیت اس کا نام
رقیب و مجیب و مقیت اس کا نام

وہی ہے علی اور وہی ہے کبیر
وہی حیی و قیوم ، واسع خبیر

وہ مہدی بھی ہے اور محیی بھی ہے
حمید و معید اور محصی بھی ہے

وہی ہے معز اور وہی ہے مذل
نہیں جس کا ثانی نہیں جس کا خل

مقدم ، موخر ، وکیل اس کا نام
وہ وہاب ، بر اور جلیل اس کا نام

وہ رزاق ہے ساری مخلوق کا
ولی اور والی ہے مملوک کا

وہی ہے کریم اور وہی ہے حسیب
وہ شہ رگ سے بھی ہے زیادہ قریب

وہ مالک ودود و غفور و رحیم
وہ حاکم وہ عادل مجید و عظیم

حفیظ و رشید و صبور اس کے نام
سلام اور قدوس و نور اس کے نام

وہی ذوالجلال اور انعام ہے
شکور و شہید اور اکرام ہے

وہی حق ہے مظہر وہی ضار ہے
تکبر اسے ہی سزاوار ہے

وہ اللہ معبود پروردگار
اسی کا ہے ہر چیز پر اختیار

مظہر حسین مظہر

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

زباں کو زورِ بیاں تیرے نطق نے بخشا
نظر کو نُورِ بصیرت عطا کِیا تُو نے
وہ عہد جس میں جہالت تھی خیمہ زن ہر سُو
اُس عہد کو نیا انداز دے دیا تُو نے

ترے لیے یہ زمیں آسماں بنائے گئے
ترے وجود سے ذہنوں میں تازگی آئی
ترے حوالے سے سب نے خدا کو پہچانا
ترے ہی دم سے چراغوں میں روشنی آئی

صراطِ حق سے ہمیں روشناس تُو نے کِیا
ترے وسیلے سے اِک رہ ہمیں سجھائی دی
ازل ابد کی مسافت پہ یوں محیط ہے تُو
ہر اِک زمانے میں آہٹ تری سنائی دی

جہانِ معنیٰ میں اِک نُور استعارہ تُو
دیارِ شوق میں خوشبو ترے حوالوں سے
ہے حرف حرف میں روشن ترے جمال کی لو
سمجھ میں آتا ہے قرآں تری مثالوں سے

خاور اعجاز

عقیدت

سرور حسین نقشبندی

خدا کے فضل و رحمت کی لپک محسوس ہوتی ہے
حضوری کی جب آنکھوں سے چمک محسوس ہوتی ہے

میں خوشبو ان در و دیوار کی یوں جذب کر لایا
یہاں آ کر بھی طیبہ کی مہک محسوس ہوتی ہے

نشانی یہ بھی ہوتی ہے شہ طیبہ کے منگتوں کی
ہمیشہ اُن کے لہجے میں کھنک محسوس ہوتی ہے

کبھی بھی نعت کی تکمیل ہوتی ہے تو پھر مجھ کو
زمیں سے آسماں تک اک دھنک محسوس ہوتی ہے

کہیں لکھا ہوا اسمِ محمد دیکھ لیتا ہوں
تو پھر دل کے دھڑکنے کی دھمک محسوس ہوتی ہے

خدا کا شکر کرتا ہوں کہ جب یہ لوگ کہتے ہیں
تیرے شعروں میں تائب کی جھلک محسوس ہوتی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے روزِ نطق! محض سخن ہیں یہ فلسفی
کشتِ عمل ژفیدہ تھے اُنؐ کے سخن تمام

حمدیہ رُباعیات

شوکت محمود شوکت

مقصود ، ہر اک شے میں خدا ہی تو ہے
مشہود ، ہر اک شے میں خدا ہی تو ہے
جس سمت نظر اُٹھے ، نظر آئے وہ
موجود ، ہر اک شے میں خدا ہی تو ہے

جب نام ترا آیا زباں پر خدا
یک گونہ سکوں قلبِ حزیں کو ملا
کیا مجھ کو سروکار جہاں سے رہے
کافی ہے مرے واسطے تیری ثنا

ایمان مرا یہ کہ ہے تُو وحدہٗ
مولا ! ہے تری حمد و ثنا چار سُو
آرام دل و جان ، ترا ذکر ہے
میں کرتا ہوں ہر وقت بس اللہ ہُو

تُو نورِ نظر ہے ، تُو ہے دل میں مکیں
تُو ہی ہے سہارا ، تُو ہی کامل یقیں
جھکتی یوں رہے سامنے تیرے سدا
مولا! یہ جبیں میری ، یہ میری جبیں

ہے وردِ زباں ، ''پاک تری ذات ہے''
دل کش یہ بیاں ، ''پاک تری ذات ہے''
سب انس و ملک اور کہیں سارے جن
مولائے جہاں ! ''پاک تری ذات ہے''

قطعات

نسیمِ سحر

کون سُنے گا

روتے رہنے سے بھی حاصل کیا ہے
سسکیاں کون سنے گا میری؟
ٹوٹنا اور بکھرنا کیا ہے
کرچیاں کون چنے گا میری؟

بنامِ 'شاعر'

جس میں کوئی شعریت ہو
پیارے، ایسا شعر کہو
داد بھی دیں گے بڑھ چڑھ کر
تُم کوئی اچھا شعر کہو !

ایک پیج

آپ اِسے سچ نہ سمجھ لیجیے گا !
اِک ڈرامہ ہے، ہم اسٹیج پہ ہیں
جس میں کرداروں کو کہنا ہے یہی
ہم سبھی ایک ہیں، اِک پیج پہ ہیں !

تیرے رنگ تیرے سنگ

خوش قسمت ہے وہ جو رب کے رنگ میں رنگا گیا مگر اس کے لیے دنیا کے رنگ جو نہ جانے دل و دماغ اور جسم و جاں پر کب سے چڑھ کر پکے ہو گئے ہیں اُتارنا ہوں گے۔ بندہ جب اللہ کی محبت والے راستے پر چلتا ہے تو دنیا کا رنگ اُترتا ہے کچھ اور آگے جاتا ہے تو اللہ کا رنگ چڑھتا ہے کچھ اور آگے جاتا ہے تو اللہ کا رنگ پکا ہو جاتا ہے قرآن کریم نے اسے صبغۃ اللہ کہا ہے یعنی اس جسم پر اس زندگی کے ہر شعبے پر اس زندگی کی ہر دلچسپی پر چال ڈھال، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، بات چیت، لین دین اور معاملات سب پر اُسی کا رنگ چھا جائے ہمارے ہاں کہیں اس کا رنگ ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا اسی صورت حال کو دیکھ کر میرا ایک دوست اللہ کی محبت میں کہا کرتا تھا۔

مینوں رنگیں آپ للاریا
وے میں چٹی ڈبو ڈب
میرے دھونے دھو دے سب

.....

سلیمان عبداللہ ڈار

دنیا میں بکھری یہ رضائیں ہوائیں خلائیں،
صدائیں یہ مرغزار پہاڑ دریا حدِ نظر تک
آنے والے لینڈ سکیپ نظر آنے والی یا نظر
نہ آنے والی مخلوقات ذرّے میں کائنات اور
کائنات کے سبھی ذرے سب اُسی کا پرتو ہیں
اُسی رب کریم کے رنگ ہیں جو اس کا ہو
جائے اُس کا رنگ خود پر اپنے آپ پر طاری
کرلے اُسی کے سنگ یہ سارے رنگ ہیں۔
یہ سارے پھول یہ سارے پودے یہ سب
سنسار! سبھی اس کی محبت کے رنگ ہیں۔
حضرت میاں محمد بخشؒ اسی بات کو بیان
کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

قدرت تھیں جس باغ بنائے جگ سنسار تمامی
رنگ برنگی بوٹے لائے کج خاصے کج عامی

ایک نوجوان جو صاحبِ دل بھی تھا اور
صاحبِ ثروت بھی ایک روز میرے پاس
بڑے تذبذب میں آیا اور کہنے لگا کہ وہ
بعض علمائے کرام سے سُنتا ہے کہ
مزاروں پر سماع جائز ہے بعض کہتے ہیں
نہیں اُسے بانسری بجانے کا بڑا شوق تھا
اس نے لاہور جا کر بڑے بڑے اساتذہ
فن سے بانسری بجانا سیکھا وہ بڑے درد
اور محبت سے عارفانہ کلام گاتا ربِّ کریم
کی محبت میں اس کی آنکھوں سے نکلنے والی
جھڑی نہ تھمتی تھی پھر اس نے عہد کیا کہ وہ
بانسری کی لے سے محبت نہیں کرے گا
آخری بار اُس نے میری ایک کتاب کی
تقریب رونمائی میں سامعین کے پرزور
اصرار پر بانسری بجائی اور اعلان کیا کہ یہ
میری کسی بھی اسٹیج پر آخری پرفارمنس ہوگی
اُس روز اس نے لمبی دعا مانگی اور بہت
رویا وہ تکبیر اولیٰ کے ساتھ نماز پڑھتا اور
بڑے خشوع وخضوع سے رکوع وسجود کرتا
میں نے اُسے بہت دلاسہ دیا اور کہا کہ
دیکھو یہ جو بھی حال تمہارے اوپر طاری
ہوتا ہے یہ سارے رنگ اللہ کی محبت کے
رنگ ہیں کبھی مالک تمہیں کسی طرف سے
اپنے قریب کرتے ہیں کبھی کسی طرف
سے تم اپنی بانسریاں پھینک دو تو بھی وہ
تمہیں اپنے طرف راغب کر سکتے ہیں اور
اگر نہ پھینکو تو بھی وہ تمہارے اپنے ہیں۔
میں نے اُسے بتایا کہ دیکھو اگر تم ساری عمر
اللہ کی محبت کے راستے پر چلتے رہو اسے
پانے کی راہ پر سفر کرتے رہو تو اُسے پا
نہیں سکتے کہ وہ مالک بے مثل ہے وہ
ابتداء سے بھی پاک ہے اور انتہا سے بھی
اور ہاں اس بات سے دلبرداشتہ بھی نہ ہونا
چاہیے کہ اگر تم ساری عمر بھی اس سے دور
چلتے رہے اُس سے دور جاتے رہے تو
بھی اس سے ایک انچ دور نہیں جا سکتے کہ

وہ شہ رگ کے قریب ہے حضرت میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں۔

لُن تنا لوتیرا بھائی سُٹ تمامی چیزاں
فرد ہووے تاں مرد کہاوے ملدا ناں عزیزاں

....

یعنی اللہ کا رنگ تب چڑھے گا جب اپنا سب کچھ اسی پر قربان کر دو اپنی ساری کی ساری دلچسپیاں رنگ روپ اُس پر وار کر پھینک دو تو پھر بندہ مسلمان بنتا ہے فقیری اس سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ اللہ کی محبت والے سفر میں آپ ایک پتنگ کی مانند ہوتے ہیں اس پتنگ کو اونچا اور اونچا اُڑنے دیں مخالفت میں آنے والی آندھیوں سے پریشان نہ ہوں دنیا کیا کہے گی لوگ کیا کہیں گے یہ ساری باتیں راہ کے روڑے ہیں منزل کے سنگِ میل نہیں اللہ کا رنگ جسم و جاں اور دل و نگاہ کو مصفّٰی اور پاکیزہ کرتا جاتا ہے اور جب یہ پکا ہو جاتا ہے تو دنیا کے ہر کچے رنگ کو روند کر گزر جاتا ہے پھر ہر چیز اس کے آگے خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہے خواہشات اور نفس کا کوئی بندا سے روک نہیں سکتا پھر یہ دل کی زمین کی آخری تہہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے زندگی کے بھی کئی رنگ ہیں اس کے شب و روز کے بھی کئی رنگ ہیں۔

اس جسم و جاں کے بھی کئی رنگ ہیں اس دل کے بھی تعلق کے بھی کئی رنگ ہیں اور محبتوں کے بھی اصل بات صرف یہی ہے کہ کونسا رنگ عمر بھر سنگ رہا تھا منزل تک پہنچے تو کس کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے جس وقت دنیا کا یہ ظاہری نظام نظر سے غائب ہو رہا ہوگا اور اللہ کا غیبی نظام ظاہر ہو رہا ہوگا اگر اس وقت تک رب کے رنگ میں رنگے رہے اور وہی رنگ پکا رہا تو پھر بزرگوں نے جیسے فرمایا ہے۔

پانی بھرن سہیلیاں رنگا رنگ گھڑے
بھریا اس دا جانیے جس دا توڑ چڑھے

....

تو ہر اس رنگ کو جو آپ نے استقامت سے نبھایا اُسی محبت سے مالک کی طرف سے اعزاز و اکرام بھی ہوگا اور حسنِ سلوک بھی سلاماً سلاماً کی آوازیں بھی استقبال کو ہونگی اور بے جوڑ موتی کے محل بھی گاؤ تکیے بھی ہونگے اور آبخورے قرینے سے لگے ہوئے ہونگے اور واقعی مالک نے ٹھیک کہا ہے کہ اے مخاطب اگر تو وہ رنگ دیکھ لے تو دنگ رہ جائے رنگ ہی تو دنگ کرتے ہیں علم کا رنگ سب سے سوا ہوتا ہے سر چڑھ کر بولتا ہے سب سے بڑی قوت بھی علم ہی کا رنگ ہے مگر اس کی معراج بھی تو حیرت ہے یعنی

وہی رنگ دیکھ کر دنگ رہ جانا!
زندگی کا سب سے خوبصورت رنگ عاجزی اور انکساری کا ہے کہتے ہیں اپنے ساجن کے پاس جائیں یا جب بھی روبرو ہوں تو اس کے لئے وہ تحفہ لے کر جائیں جو محبوب کے پاس نہ ہو رب کے پاس عاجزی نہیں ہے انکساری نہیں ہے ہم یہ گفٹ لے کر اس کے روبرو ہوں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی آئے چوکھا یوں تو یہ ایک معروف محاورہ ہے مگر انکساری سے بھرپور سجدوں کے ساتھ اللہ کی قربت یقینی ہے اس پہ کچھ خرچ بھی نہیں آتا اور رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔ اپنے مالک کی قربت حاصل کرنے کا یہ شارٹ کٹ ہے خصوصاً دعائے نیم شبی کے وقت راتوں کا پچھلا پہر گزرتا ہے اس طرح آتی ہے تری یاد دلاتی ہے تیری یاد بندہ رات کے پچھلے پہر اپنے نرم و گداز اور تگھے[1] کمبل میں سے چوروں کی طرح اُٹھے گھر والوں کو بیوی بچوں کو بھی خبر تک نہ ہونے پائے اُس وقت اپنے رب سے دل کی بات کی جائے تو پھر دل سے جو رنگ اُترتا ہے اور دل پر جو رنگ چڑھتا ہے وہ آسانی سے اُترتا نہیں۔ دراصل یہ جگ رنگ سنگ زنگ اور ڈھنگ کی ہے ایک کہانی ہے کاش راقم کو بھی اور ہمیں یہ سمجھ آجائے کیونکہ جب رات چل چل کے تھک چکی ہوتی ہے جب تارے اونگھ رہے ہوتے ہیں جب شہر کا شہر اور ملک کا ملک سویا ہوتا ہے اُس وقت خال خال ہی لوگ جاگتے ہیں

ر۔ رات دا جاگنا بہت مشکل
یا کوئی چور جاگدا اے سنّھ[2] اُتے
یا کوئی جاگدا اے بڑا بیمار راتی
یا فیر دل وچ عشق دی زرح ہوئے
یا کوئی جاگدا اے یار دا یار راتی

آج کے دور کا مسلمان پریشان ہی اس لئے ہے اس کا سب سے بڑا المیہ ہی یہی ہے کہ وہ اور ہر کسی سے اپنے مسائل Share کرتا ہے اپنے رب سے نہیں بیوی سے بیٹے سے کسی واقف کار سے کولیگ سے محلے دار سے اور ماہر نفسیات سے دل کی بات کہہ دیں گے کسی جگری دوست کو رازدار بنالیں گے اور حقیقی دوست یعنی اپنے رب سے دل کی بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ مسائل جس کی طرف سے اُترتے ہیں ان کا حل بھی وہی جانتا ہے ہم نے کبھی اُس سے

---

1. تگھے: سردیوں میں تمازت بھرا
2. سنّھ: نقب لگانے والی جگہ

حل پوچھا ہی نہیں وہ تو ایسا سخی مالک ہے ایسا دیالو ہے کہ مانگنے والا کبھی اس کے در سے خالی نہیں جاتا مانگنے والا بس اصل مانگت ہی ہو تو اس سے مانگنے والا کبھی نہیں اُکتاتا۔

ہم فانی سے فانی چیزیں مانگتے ہیں مانگنا تو لافانی سے چاہیے جسے فنا نہیں اور لا فانی سے بھی فانی مانگتے ہیں ایک ہونے کے باوجود جس کی گنتی کرنا ممکن نہیں وہ ہر شمار میں ہے مگر اُسے شمار نہیں کیا جا سکتا کوئی اس کا رنگ اپنا کر تو دیکھے۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں ہمیں پڑھایا جاتا ہے کہ سات رنگ مل کر سفید روشنی بناتے ہیں واقعی سائنس روم میں جا کر سکول کی عمر میں ہم سات رنگوں والے دائرے کو زور زور سے گھماتے تھے تو وہ سفید نظر آتا تھا کہتے ہیں اللہ پاک ٹوٹے ہوئے اور سفید دلوں میں رہتے ہیں ان سفید دلوں میں بھی ہو سکتا ہے سات رنگ ہوں کوئی محبت والی نماز کا رنگ کوئی تلاوت کا رنگ کوئی صدقات کا رنگ کوئی مالک کی یاد کا رنگ کوئی جولائی کے روزوں کا رنگ کوئی دسمبر میں یخ پانی سے وضو کا رنگ کوئی دل سے کی گئی توبہ کا رنگ یہ سات رنگ ہو گئے جو اللہ کی محبت کا سفید رنگ بن کر ابھرتے ہیں یہ ساتوں کے ساتوں رنگ اللہ ہی کے رنگ ہیں رب کا تو کوئی اپنا رنگ نہیں تجسیم ہی نہیں بس ہر رنگ اُسی کا رنگ ہے ہر رنگ میں وہ چھپا ہوا ہے ہر رنگ میں وہی ظاہر ہے وہ مری کی سبزہ زار چوٹیاں ہوں یا چولستان کے کھیت وہ گلگت کے پہاڑ ہوں یا شنگریلا کی وادیاں وہ صد پارہ جھیل ہو یا سکردو کے نظارے سبھی اُس کے رنگ ہیں اس کے سنگ ہیں وہی تو ان سب رنگوں میں چھپا ہوا ہے وہی تو ان سب رنگوں سے ظاہر ہے جو اپنے رب کے قریب ہو جائیں وہ پھر رنگوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ وہ پھر کلر فل زندگی کی تمنا نہیں کرتے وہ پھر بھی کہتے ہیں کہ

رب دے بندے اوتھے رہندے جتھے عقل دے انّھے
تاں اونھاں کوئی جانے تجھے نہ اُناں نوں منّے

وہ اس کی یاد میں بیٹھیں تو اُس کے نور کو دیکھتے ہیں اُسی میں سارے رنگ دیکھتے ہیں اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کوئی ایک رنگ بھی نہ دیکھ سکے کوئی بھی رنگ دیکھ لے اللہ کی صفات کے رنگ دیکھ لے ذات کے رنگ بھی وہ خود کسی کو دکھانا چاہے تو اُسے کوئی نہیں روک سکتا ہر رنگ اس تک لے جاتا ہے۔ ہر رنگ محبت کا ہاتھ پکڑ کر اللہ کی محبت والے راستے پر چل نکلتا ہے پھر ایک سٹیج ایسی آتی ہے جسے قرآن مجید نے صبغۃ اللہ کہا

ہے یعنی بندہ دین میں سو فیصد داخل ہو جاتا ہے اس کی زندگی کا ہر رنگ اپنے مالک کے رنگ میں رنگا جاتا ہے۔

بندے کو ہر دم اپنے دل میں جھانک کر پوچھتے رہنا چاہیے۔ ''دیکھ! سچ سچ بتا تیرا کیا رنگ ہے ایمان والا رنگ ہے یا؟ دیکھ مالک دلوں کی تہوں میں چھپی خیانتوں اور رنگوں کو جانتا ہے اس سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں سب رنگوں کے اپنے اپنے سلسلے ہیں مگر ہیں سبھی اُسی کے رنگ؟ کائنات میں جو کچھ ہے یہ خالق ہی کے رنگ ہیں اور کیا! سب سے حسین رنگ حُسنِ نیت کا رنگ ہے صحابہ اکرامؓ تابعین اور ہمارے بزرگوں کا رنگ حُسنِ نیت ہی کا رنگ تھا انسانیت کی بھلائی کا جس نے یہ رنگ اپنا لیا پھر اس نے حق گوئی اور بے باکی کا کاروبار کیا اور یہ ایسا کاروبار ہے جس میں کبھی گھاٹا نہیں ہوتا۔ اللہ کی محبت کا تو ایک ہی رنگ ہوتا ہے دوسرا کوئی نہیں لیکن میں سائنس کا طالب علم ہوں اس لئے پڑھتا ہوں کہ روشنی کی کرن سات رنگوں سے بنتی ہے ست رنگی کہہ لیں اللہ کا رنگ تو سب رنگ ہے اور ''سب کا'' ہے رنگ خوبصورت کا نام ہے اہل علم کہتے ہیں رنگ کے 29 معانی ہیں اگر سات رنگوں کو ملایا جائے تو 36 معانی بنتے ہیں رنگ کثیر المعانی لفظ ہے جیسے انداز قسم، لطف، رسم، قاعدہ، دستور، مزہ، چور، تماشا، نشہ، نظیر، نوع، رویہ، انداز، سلوک، برتاؤ، کیفیت، شغل، بہار، روش، فریب، خون، تاش کی بازیوں کا نام، موسم، رونق اور خوبصورت یہ سب بھی کسی نہ کسی طرح رنگ ہی کے معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔ جو بھی رنگ ہم اپنے دل میں بوئیں گے وہی زندگی میں ظاہر ہوگا ہم جیسے ہی اپنے باہر سے اپنے اندر کی طرف سفر کریں وہیں ہمارے رنگ ظاہر ہو جائیں گے بھگت کبیر جیسے اللہ والے اسی بونے اور کاٹنے پر روئے تھے۔

رنگی کو نارنگی کہیں
جلے دودھ کو کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں
دیکھ کبیرا رویا
کرنا تھا سو کیوں کیا
اب کر کیوں پچھتائے
بویا پیڑ ببول کا
آم کہاں سے آئے

☆☆☆☆☆

بیادِ بادِ خلیق

شفیق بھائی ہم بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین تھے۔ مگر بوجوہ عمر بھر خود کو مربوط ومنضبط نہ کر پائے۔ دیہات اور قصبوں سے تعلق رکھنے والے ہم جیسے نوجوانوں کے لیے انٹرمیڈیٹ کا زمانہ بڑا نازک مرحلہ ہوتا تھا۔ تعلیم کی خاطر گاؤں سے شہر تک کا یہ سفر ایسے ہوتا تھا جیسے بیابان سے پرستان چلے آئے ہوں۔ شفیق بھائی نے کوٹ رادھا کشن سے دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر واقع گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ شیر سنگھ سے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ہاکی کے مشاق کھلاڑی کے طور پر ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی اپنی بہترین صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آج بھی اسی طرح زندہ و تازہ ہے، جب وہ اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ تحصیل کی سطح کے سالانہ ٹورنامنٹ میں جیتی ہوئی ہاکی کی چیمپئنز ٹرافی اٹھائے ریل گاڑی سے اترے تھے اور پھر اپنے دیگر رفقا کے ہمراہ جلوس کی صورت اسٹیشن سے ایک عجیب فاتحانہ شان سے مین بازار کے مرکزی چوک تک آئے تھے۔ قصبے کے ہر چھوٹے بڑے کا چہرہ فخر و مسرت کے تاثرات سے جگمگا رہا تھا۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ ہم سب سے آگے تھے۔ ان کی خوش لباسی کا پورے خاندان میں بہت چرچا تھا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ انہوں نے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ میں داخلہ لیا تو

جلیل عالی

والدین کی استطاعت سے کہیں بڑھ کر کالج کی یونی فارم کے پتلون کوٹ کے علاوہ اپنے لیے ایک خوبصورت گرم سوٹ بھی سلوایا۔ مگر شہر کی ہوا تعلیمی میدان میں ذہانت کے لئے سامانِ شرمندگی بن گئی۔ فلموں اور آوارگی کے شوق نے امتحان میں سپلی سے دو چار کیا اور بڑی مشکل سے انٹرمیڈیٹ کی لکیر پار ہوئی۔

گاڑی پٹری سے اتر گئی۔ پہلے ملازمت کے لئے دوڑ دھوپ ہوئی۔ جب تعلیمی کم مائیگی کسی باوقار کام کے حصول میں کامیاب نہ ہو پائی تو سب سے بڑے لطیف بھائی جان کی سرپرستی میں اسلامیہ کمرشل کالج لاہور سے آئی کام کیا۔ لطیف بھائی جان کا تبادلہ ہوگیا تو فیصل آباد میں بڑی بہن کا دامنِ شفقت تھاما اور انکم ٹیکس پریکٹیشنر بہنوئی محمد حنیف کے مشورے پر بی کام میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی تعلیمی میدان سے زیادہ ہم نصابی سرگرمیوں میں نام کمایا۔ اور کالج کی ڈرامہ کلب کے تحت ایک ڈرامے میں علامہ اقبال کا یادگار کردار ادا کیا۔ بی کام سے فارغ ہوکر مختلف چھوٹی موٹی ملازمتیں کرنے کے بعد بہتر حصولِ رزق میں قسمت آزمائی کی خاطر سفر کو وسیلۂ ظفر بناتے ہوئے ابوظہبی روانہ ہو گئے۔ ایک اسکول میں تدریس کے علاوہ تھوڑی سی اضافی تنخواہ کے ساتھ حساب کتاب کی ذمہ داری بھی تفویض ہوگئی۔

جن دنوں وہ چھوٹی موٹی ملازمتوں کے ادل بدل سے گزر رہے تھے میں اورینٹل کالج لاہور میں ایم۔اے اردو کا طالب علم تھا۔ انہی دنوں احمد ندیم قاسمی فنون کا غزل نمبر مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے مختلف مشاعروں میں مجھے اور میرے ہم جماعت امجد اسلام کا کچا پکا کلام سنا تو کمال شفقت سے ہم دونوں کو دس دس غزلیں فراہم کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ یوں اشاعتی دنیا میں ہمارا پہلا تعارف شاعری کی اس تاریخی دستاویز کے توسط ہوا جو بڑے اعزاز کی بات تھی۔

شفیق بھائی شعر تو مجھ سے پہلے سے کہہ رہے تھے مگر یہ شاعری خاندانی افراد یا غیر ادبی دوستوں کے درمیان سنانے جانے تک محدود رہی۔ ادب کا باقاعدہ طالب علم ہونے کی بنا پر میٹرک کے دنوں میں راہ پانے والے میرے شعری ذوق وشوق کی تربیت کے مواقع بڑھنے سے مجھے کسی حد تک فکری وفنی شد بد حاصل ہو چکی تھی۔ یہ شفیق بھائی کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے دوسری جگہ بڑے ہونے کے باوجود اپنی شعری کاوشوں بارے مجھ سے مشاورت میں کبھی عار محسوس نہ کی۔ میں جب اردو کے بعد سوشیالوجی میں ایم اے کر چکا تو سی بی کالج واہ کینٹ میں اردو لیکچرار کی ملازمت

ملنے پر مجھے لاہور چھوڑنا پڑا۔ جانے سے پہلے میں نے شفیق بھائی کو اپنے دوست خالد احمد سے متعارف کروایا کہ ان کی شعری نمو اور تخلیقی تسکین میں تعطل نہ آئے۔ یہ تعلق اتنا بابرکت ثابت ہوا کہ وہ شعری لطافتوں کے اخذ و اکتساب میں خالد احمد کے کردار کا زندگی بھر برملا اعتراف کرتے رہے۔ خالد احمد جو ایک مشاق شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فنون کے لیے ٹیلنٹ ہنٹر کا کام بھی کرتا تھا، جلد ہی انہیں احمد ندیم قاسمی صاحب کے پاس لے گیا۔ اور یوں وہ بھی فنونیے ہو گئے۔ کئی برس تک ندیم صاحب کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ شفیق سلیمی میرے بڑے بھائی ہیں۔ چنانچہ اشاعتی دنیا میں تاخیر سے داخلے کی بنا پر وہ انہیں میرے بعد چھاپتے رہے۔ پھر جب انہیں حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے چہرے پر ایک معصوم سی شرارتی مسکراہٹ لاتے ہوئے اعلان کیا کہ شفیق صاحب اب تو میں آپ کا کلام جلیل عالی سے پہلے ہی درج کیا کروں گا۔ مجھے پہلے سے ندیم صاحب کی قربت کا اعزاز حاصل تھا۔ شفیق بھائی بھی جلد ہی ان کی نگاہ میں آ گئے۔ مگر ابوظہبی میں قیام کے دوران خط کتابت، ٹیلی فونی رابطے اور دو تین بار بیرونِ ملک میزبانی کے ناتے وہ ان کے اور بھی زیادہ قریب ہو گئے۔

ابوظہبی میں جشنِ ندیم کا اہتمام ہوا تو دنیا بھر سے شعرا و ادبا کو مدعو کیا گیا۔ پاکستان کے مختلف شہروں کے سرکردہ قلمکاروں کو دعوت دی گئی۔ اسلام آباد سے ضمیر جعفری اور اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین پریشان خٹک کے ساتھ خاکسار کو بھی شامل کر لیا گیا۔ شفیق بھائی نے مجھے بتایا کہ انتظامیہ کا حصہ ہونے کے باوجود انہوں نے کہیں میرا ذکر نہیں کیا۔ جب فہرست ندیم صاحب کے سامنے لائی گئی تو انہوں نے اپنے ہاتھ سے میرے نام کا اضافہ کیا۔ یہ بات ہم دونوں بھائیوں کے لیے طمانیت کا باعث تھی کہ ہم آگے بڑھ بڑھ کر اپنی جگہ بنانے یا نمایاں ہونے کی بے تابی کے مظاہرے کو برا جانتے تھے۔ اس طرح کی اخلاقی جھجک خاندانی وراثت کے طور پر ہمارے لہو میں شامل تھی۔

ہمیں ابوظہبی کے ایک شاندار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ میزبانوں کی طرف سے ایک رات ناؤنوش کا اہتمام تھا۔ شفیق بھائی نے بڑی شفقت اور محبت سے مجھے کہا کہ احترام وحجاب کو چھوڑو اور بلا جھجک تم بھی شریک ہو جاؤ۔ میں نے کہا نہیں بھائی جان، اوّل تو میرا یہ مسئلہ ہی نہیں ہے۔ پھر میں اقبالی اسلامی خیالات کا آدمی ہوں۔ ان میں سے اکثر کے ساتھ میرا نظریاتی اختلاف ہے۔ اگر میں ذرا چکھنے کی حد تک بھی شامل ہو گیا تو

وہ عمر بھر اس واقعے کو میرے خلاف استعمال کرتے رہیں گے۔

ایک بار اسکوٹر کے حادثے میں شفیق بھائی کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ میں فوراً پنڈی سے لاہور پہنچا۔ انہیں بستر پر معذوری کی حالت میں دیکھ کر بہت ڈپریشن ہوا۔ میں جب بھی لاہور جاتا ندیم صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ اس بار ندیم صاحب دفتر میں اکیلے تشریف فرما تھے۔ انہوں نے بھائی جان کی طبیعت کا پوچھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ ایسی حالت میں کسی پُرخلوص اور سچے ہمدرد انسان کے سامنے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ میرا یہ شعر شاید ایسے ہی کسی لمحے کی دین ہے۔

حرف ہمدرد آبشار کرے
آنکھ کی جھیل میں رکا پانی

شفیق بھائی اور میرے درمیان باقی بہن بھائیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ موانست تھی۔ وہ مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ یہ الگ بات کہ بعض اوقات ان کی محبت ہم دونوں کے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بھی بن جاتی۔ سب سے پہلے تو میں اس محبت کے ایک ایسے مظاہرے کا ذکر کرتا ہوں جو ان کی کوشش بسیار کے باوجود ثمرور ثابت نہ ہو سکا۔ بچپن میں ابا، امی ہمیں باہر گلی میں بھی نہیں نکلنے دیتے تھے کہ ہمارے اخلاق خراب نہ ہو جائیں۔ ہم گندی گالیاں وغیرہ نہ سیکھ جائیں۔ مجھ پر ان پابندیوں کا نفسیاتی اثر یہ ہوا کہ مجھے سکول جانے سے ڈر لگنے لگا۔ ہر روز سکول کھلنے کے وقت ایک تماشا لگتا۔ کبھی میں پیٹ درد کا بہانہ کرتا۔ کبھی خود ہی سختی کہیں چھپا دیتا کہ اسے ڈھونڈو۔ وہ ملے تو سکول جاؤں گا۔ اکثر پٹائی بھی ہو جاتی۔ بعض اوقات شفیق بھائی کی ڈیوٹی لگتی کہ اپنے ہائی سکول جانے سے پہلے مجھے سکول چھوڑ کر آئیں۔ شفیق بھائی مجھے گردن سے دبوچ لیتے اور دھکیلتے ہوئے سکول تک لے جاتے۔ سکول ہمارے گھر سے دو تین فرلانگ کی دوری پر تھا۔ ہماری گلی اور سکول کے درمیان سے نہر گزرتی تھی اس لیے ڈیڑھ ایک فرلانگ پر واقع پل سے نہر پار کر کے چند قدم کی واپسی پر سکول پہنچ جاتے۔ میرا یہ سفر ہر روز محلے والوں اور دیگر راہگیروں کی تفریح کا سامان بنتا۔ والد صاحب اساتذہ کو میرے لیے جیب خرچ اور ٹافیاں وغیرہ بھی دیتے کہ کسی صورت سکول سے میرا لگاؤ پیدا ہو۔ مگر جب کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی تو ہماری گلی کے شروع والے مکان میں رہائش پذیر

ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے ابا سے کہا کہ چوہدری صاحب آپ بچے پر اتنی سختی نہ کریں میں اسے اپنے ساتھ لے جایا کروں گا۔ چنانچہ سکول کھلنے سے آٹھ دس منٹ پہلے مجھے گھر سے گلی میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے سپرد کر دیا جاتا۔ ان کی شخصیت اتنی رعب دار تھی کہ وہ جب اپنا حقہ اٹھائے تشریف لاتے تو انہیں مجھے ہاتھ بھی نہ لگانا پڑتا۔ میں ان کے خوف سے ان کے آگے آگے تقریباً بھاگتا ہوا چلا جاتا۔ شعور کی ذرا سی پختگی سے لے کر آج تک ان ہیڈ ماسٹر صاحب کا یہ تعاون میرے ذہن میں ایک بڑے احسان کا احساس بن کر ہمیشہ تازہ رہا ہے۔

دو واقعات ایسے ہیں جن میں شفیق بھائی کی محبت میرے لیے تو ایک طرف خود ان کے لیے بھی مشکل کا باعث بن گئی۔ ہمیں اپنے کھیتوں، اپنے برف کے کارخانے یا پنجابی کے شاعر بڑے بھائی حفیظ سلیمی کے گھر جانے کے لیے نہر کے دونوں کناروں پر رکھے درخت کے ایک شہتیر نما تنے پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ایک بار شفیق بھائی میری انگلی پکڑ کر اس تنے پر سے مجھے نہر پار کروا رہے تھے کہ میرا پاؤں پھسلا اور میں پانی کے بہاؤ کی مخالف سمت نہر میں گر گیا۔ شفیق بھائی نے مضبوطی سے میری کلائی پکڑ لی۔ پانی کے زور سے سر سمیت میرا پورا جسم تنے کے دوسری طرف چلا گیا۔ پانی کی لہریں بار بار میری ناک پر یلغار کرتیں۔ میں بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ دور سے نہر میں کپڑے دھوتے ایک دھوبی نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ تیزی سے مدد کو پہنچا۔ اس نے شفیق بھائی کے ہاتھ سے میری کلائی چھڑائی اور انہیں بہت ڈانٹا کہ تم تو بچے کی جان لینے پر تلے ہوئے ہو۔

اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ یہ ہوا کہ ہم سب بہن بھائی جلو کے قریب بھماں نامی ایک گاؤں میں اپنی خالہ کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ برسات میں ان کی کچی چھت ٹپکنے لگی۔ بارش تھمی تو خالہ بولیں بچو ذرا چھت پر چلے جاؤ۔ آپ کے چلنے پھرنے سے شاید ٹپکا رک جائے۔ ہم سب اوپر مزے کرنے لگے۔ اچانک شفیق بھائی پکڑو پکڑو پکارتے ہوئے میری جانب بڑھے۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹنے لگا اور ہٹتے ہٹتے منڈیر سے ٹکرا کر ہمسائیوں کے صحن کی طرف لڑھکا تو میری ٹانگ شفیق بھائی کے ہاتھ میں آ گئی۔ تھوڑی دیر تو انہوں نے مجھے تھامے رکھا۔ میرے وزن سے خود بھی لڑھکنے کے قریب ہوئے تو ٹانگ چھوڑ دی۔ اب جو میں پیٹ کے بل کیچڑ میں گرا تو ہمسائی خاتون دوڑتی ہوئی میری مدد کو آئیں۔ میں سمجھا مجھے مارنے آ رہی ہیں کہ میں ان کی

طرف کیوں گرا ہوں۔ چنانچہ میں خوف کے مارے جلدی سے اٹھا اور بھاگتے ہوئے خالہ کے گھر پہنچ کے بے ہوش ہو گیا۔ کئی روز تک روئی گرم کر کر کے میرے جسم پر ٹکور کی جاتی رہی۔ اور میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔

شاید اس کی ایک وجہ شعری اشتراک بھی تھی کہ شفیق بھائی میرے ساتھ خاص شفقت فرماتے تھے۔ وہ ان دنوں داروغہ والا میں رہتے تھے۔ ابھی میری شادی کو زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ میری خوش دامن کا گھر شالامار باغ کے قریب واقع واپڈا کالونی میں تھا۔ ہم میاں بیوی کچھ دنوں کے لیے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے گھر کے صحن میں کھڑے برادر نسبتی طیب فیروز کے خستہ حال سکوٹر پر اپنی مدد آپ کے تحت ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش کی۔ اور ذرا سا ہاتھ سیدھا ہوا تو اسی روز بیگم سے کہا کہ چلو سکوٹر پر شفیق بھائی کے ہاں چلتے ہیں۔ وہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پیشتر پہلی بار سکوٹر کو چھوا ہے فوراً تیار ہو گئیں۔ میں بہادرانہ جذبہ و جوش میں انہیں پیچھے بٹھا کر بھائی جان کے ہاں لے گیا۔ شفیق بھائی کو جب پتا چلا کہ ہم اسکوٹر پر آئے ہیں تو بجائے تحسین کے انہوں نے مجھے خوب ڈانٹ پلائی کہ تم نے یہ کیا حرکت کی ہے؟ اپنی بیوقوفی سے نئی نئی دلہن کی جان بھی خطرے میں ڈال دی۔ میرا تو سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا اور ساری خود اعتمادی ہوا ہو گئی۔ شفیق بھائی نے سب بھانپ لیا اور میری بیگم کو اپنے اسکوٹر پر بٹھا کر واپس گھر چھوڑا۔ میں کیا بتاؤں کہ میں نے تین چار کلو میٹر کا فاصلہ ان کے آگے آگے اسکوٹر چلاتے ہوئے کس گھبراہٹ اور خوف کے عالم میں طے کیا۔

ایک اور موقع پر میری بدحواسی میں ان کی شفقت میرے بہت کام آئی۔ ہوا یہ کہ اسلم کمال نے ہم نوبیاہتا جوڑے کو کھانے پر بلایا تو ساتھ شفیق بھائی کو بھی مدعو کر لیا۔ اسلم کمال ان دنوں وحدت کالونی گورنمنٹ کوارٹرز میں ٹینکی کے قریب رہتے تھے۔ میری ڈرائیونگ کو ابھی چند روز ہی ہوئے تھے۔ اوپر سے اسکوٹر کے گیئر ٹھیک سے کام نہیں کرتے تھے۔ میں نے بیگم کو اپنے ساتھ بٹھایا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ شفیق بھائی بھی اپنے اسکوٹر پر شالامار باغ سے ہمارے ساتھ ہو لیے۔ ہم نے مغلپورہ کی طرف سے نہر کا راستہ اختیار کیا۔ مال روڈ کراس کرتے ہوئے گیئر کی خرابی سے اسکوٹر بند ہوا تو میں نے بیگم سے کہا مال روڈ پیدل کراس کر کے دوبارہ اسکوٹر پر بیٹھیں گے۔ میں اسکوٹر کو گھسیٹتے ہوئے مال روڈ کے

پار لے گیا۔ بیگم بھی میرے پیچھے پیچھے ہو لیں۔ اُدھر پہنچ کر میں نے اپنی رو میں دوبارہ اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور چل پڑا۔ وحدت کالونی کے قریب پہنچ کر بیگم سے مخاطب ہو کر بولا کہ بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔ پیچھے سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو سیٹ خالی تھی۔ گھبرا کر اسکوٹر روکا اور پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ خیال آیا کہیں گر گئی ہیں۔ واپس مڑنے ہی والا تھا، دیکھا کہ وہ شفیق بھائی کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھی ہوئی مسکرا رہی ہیں۔ انہیں صحیح سلامت دیکھ کر جان میں جان آئی۔ معلوم ہوا کہ کہ مال روڈ کی سڑک پار کرنے کے بعد بیگم کو سوار کرائے بغیر بدحواسی میں اسکوٹر اسٹارٹ کر کے اکیلا ہی چلا آیا۔ خوش قسمتی یہ ہوئی کہ شفیق بھائی اسی خیال سے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے تھے کہ نظر رکھیں کہیں نیا نیا ڈرائیور کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔

مجھے ہمیشہ یہ لگا کہ کہ بے شک محاورے اور ضرب الامثال عمومی صداقتوں کی ترجمانی کرتے ہیں مگر استثنائی صورتیں اپنی جگہ موجود رہتی ہیں۔ چنانچہ وہ جو بڑی مشہور ضرب المثل ہے کہ' خر باش برادر خرد مباش'، میرے اور شفیق بھائی کے تعلق میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ میرے لئے تو ان کا چھوٹا بھائی ہونا ہمیشہ مسرت و انبساط کا باعث رہا۔ وہ مجھ سے دوسری جگہ پر بڑے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان منیر منتظر ہیں جن کا ایک ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ایک بار ایک بے تکلف دوست نے مجھ سے پوچھا کہ آپ دونوں بھائیوں کے درمیان کبھی شاعرانہ چشمک پیدا نہیں ہوئی؟ میں نے کہا کہ قدرت نے ہمیں اس سے بچانے کے لئے بفرزون کے طور پر ہمارے درمیان ایک افسانہ نگار پیدا کر رکھا ہے۔

جہاں ٹی ایس ایلیٹ کی یہ بات درست ہے کہ فنکار کو کچھ نہ کچھ لکھتے رہنا چاہیے تا کہ جب حقیقی تخلیقی لہر آئے تو قلم کی عدم روانی رکاوٹ نہ بنے وہاں غالب کی یہ بات بھی غلط نہیں کہ تخلیقی وقفے بھی روانیِ طبع کے لیے بے حد ضروری ہوتے ہیں۔

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

زود گوئی اور اصلاح کے نام پر مشینی طریقے سے دوسروں کے لیے کثرت سے شعر گھڑتے رہنے سے شاعر کا اندر خالی ہوتا رہتا ہے اور اس کی تخلیقی قوت و اہلیت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس حوالے سے شفیق بھائی نے اپنی تخلیقی ذات کو بہت نقصان پہنچایا اور کثرت سے دوسروں کے لیے لکھتے رہنے کے عمل نے انہیں اپنے اندر کے شاعر

کے ساتھ انصاف نہ کر سکے دیا۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بڑے معنی خیز انداز میں یہ انکشاف کیا کہ "وہ خالی کاغذ پر بھی اصلاح دیتے ہیں" میں نے اسے تہذیبی آلودگی پھیلانے کا نام دیتے ہوئے اپنی نا پسندیدگی کا اظہار کیا تو بولے کہ یہ میری مالی مجبوری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر شفیق بھائی اپنی شاعری کی طرف پوری توجہ دیتے تو وہ اپنے منفرد منطقہِ فکر و احساس میں اپنا نقش کہیں زیادہ گہرا اور تابدار کر جاتے۔ قدرت نے ان کو سامنے کی چیزوں اور معمول کے مظاہر سے کوئی نہ کوئی نیا پہلو نکال لینے کی حیرت انگیز صلاحیت سے نواز رکھا تھا۔ ان کے طرز اظہار کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ حکیم مومن خان مومن کی طرح اپنے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی ایسی گرہ رکھ دیتے تھے کہ اس کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے قاری کو ذرا غور کرنا پڑے اور جب بات کھلے تو وہ ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہو۔ ان کے کلام کی جمالیاتی کشش میں یہ اخفائی عنصر کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

شفیق وہ تو بنا ہے عجیب مٹی سے
کہ دے کے دستکیں سنگِ صدا بھی ٹوٹ گیا

دشمنوں سے بھی تعلق دوستوں کے ساتھ ساتھ
دھوپ بھی نکلی ہوئی ہے بارشوں کے ساتھ ساتھ

ہاتھوں میں بجھا چراغ لے کر
اندھا ہمیں راستہ دکھا رہا ہے

تلاشِ رزق میں ہجرت کی مختلف کیفیات کے بیان میں ان کی شاعری ہمیشہ ایک منفرد آواز کے طور پر پہچانی جاتی رہے گی۔ ان کے کئی اشعار ہمارے اجتماعی حافظے کا مستقل حصہ بن چکے ہیں۔ بھلا اس طرح کے اشعار کو کون بھول سکتا ہے۔

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے
اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

بے نام دیاروں سے ہم لوگ بھی ہو آئے
کچھ درد تھے چن لائے کچھ اشک تھے رو آئے

مدت کے بعد آئے تو روٹھی ہوئی سی تھی
تختی ہمارے نام کی در پر لگی ہوئی

پیکٹوں میں بند ہو کر اب ملے گی روشنی
بوتلوں سے شہر کو تازہ ہوا دی جائے گی

تحریکِ پاکستان کے زمانے میں ہمارے والد ضلع امرتسر میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ضلعی نائب صدر تھے۔ ان کی فعال سیاسی زندگی کے اثرات ہم سب بھائیوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر ہم تین بھائیوں، شفیق بھائی، ان سے چھوٹے منیر منتظر بھائی اور خاکسار کے

ہاں یہ اثرات اور بھی نمایاں طور پر سرایت کیے ہوئے تھے - ہمارے گھر کا ماحول خالص جمہوری ماحول تھا- شفیق بھائی ترقی پسند رجحانات رکھتے تھے، منیر منتظر سیکولر انقلابی خیالات کے مالک ہیں اور میں اقبالی اسلام پسند- ہم جس محفل میں بھی اکٹھے ہو جاتے گرما گرم بحث شروع ہو جاتی- گھر میں ایسی بحثوں میں ہمارے کف اڑاتے لب و لہجے اور جوش سے ہماری والدہ بہت پریشان اور فکر مند ہو جاتیں کہ کہیں گتھم گتھا نہ ہو جائیں- ہم ان کو تسلیاں دیتے کہ ایسا کوئی خدشہ نہیں ہم صرف اختلاف رائے کا اظہار کر رہے ہیں- ہماری بیگمات بھی ابتدا میں اس جدل سے بہت پریشان ہوئیں پھر آہستہ آہستہ اس کی عادی ہو گئیں-

سب کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنے والے شفیق بھائی کسی سے اپنی ذاتی پریشانیوں کا ذکر نہیں کرتے تھے - تمام زندگی مالی معاملات سلجھانے کی جد و جہد میں گزر گئی- ہمارے سب سے چھوٹے بھائی ندیم نے مجھے بتایا کہ جن دنوں وہ دبئی میں ملازمت کرتا تھا ایک روز شفیق بھائی جان سے ملنے گیا تو وہ اسے ساحلِ سمندر پر لے گئے- کچھ پریشان دکھائی دے رہے تھے- اس کے اصرار پر بتایا کہ بیٹی کی شادی سر پر ہے اور تمہاری بھابی سے ضروری اخراجات کے بندوبست کے حوالے سے فون پر بد مزگی ہو گئی ہے- انہوں نے شادی کے اخراجات کے لئے پیسوں کا مطالبہ کیا تو میں نے کہا کہ میں تو اپنی دال روٹی کے خرچ کے سوا ساری تنخواہ باقاعدگی سے آپ کو بھجواتا رہا ہوں - وہ سب پیسے کیا ہوئے؟ میرے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے- بولیں وہ تو سب گھر کے اخراجات میں صرف ہو گئے- پھر شور مچاتی ہوئی لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے شدید کرب میں یہ جملہ ادا کیا "اب تم ہی بتاؤ کہ ان حالات میں بندہ سمندر میں نہ کود جائے تو کیا کرے!"

رحلت سے دو تین ماہ پیشتر شفیق بھائی کی صحت تیزی سے گرنے لگی- بیسیوں ٹیسٹ ہوئے مگر کوئی کلیدی وجہ معلوم نہ ہو سکی- در اصل بڑی بیٹی کی بیوگی کا دکھ، اپنی شریکِ حیات کی یادداشت کے انحطاط کی پریشانی اور بیٹے کی بے روزگاری کا غم انہیں اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا- عدیلہ بیٹی نے تو اپنے میاں کی وفات کے بعد بچوں کی تعلیم و تربیت اور گھر چلانے کے لئے ملازمت کے ساتھ ایم- اے انگریزی اور پھر پی- ایچ- ڈی کر کے ابو کو اپنی بلند ہمتی اور مضبوطی کا یقین بھی دلا دیا مگر ان کی فکر مندی میں خاطر خواہ کمی واقع نہ ہوئی- میں فون پر مزاج پرسی کرتا تو جواب آتا "یار اور تو سب ٹھیک ہے بس ذرا جسمانی

کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں۔"
آخری دنوں کے درمیان میں نے تنقیدی مضامین پر مشتمل اپنی کتاب "شعری دانش کی دھن میں" کے کچھ نسخے انہیں بھجوائے۔ فون پر بات کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ آپ کے قریبی احباب کے لیے ہیں۔ اور وہ جو میں نے آپ کی شاعری پر مضمون لکھا تھا وہ اس مجموعے میں شامل نہیں کیونکہ اس کتاب کا آخری مضمون خالد احمد کی غزل گوئی پر ہے۔ آپ والا مضمون انشاء اللہ اگلے تنقیدی مجموعے میں شامل کیا جائے گا۔ بولے "یار میں اب ان سب چیزوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔" مجھے اس جملے سے جھلکتی نیس اور بے دلی پر بہت تشویش ہوئی۔ پھر ایک دن بتایا کہ دو تین روز ہوئے کرونا کی ویکسین کروالی ہے مگر گلے میں معمولی سی خرابی محسوس ہوتی ہے۔ فیملی ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ ویکسین کا ردِعمل ہوگا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تکلیف بڑھنے پر ٹیسٹ ہوا تو کرونا پوزیٹو نکلا۔ چند روز گھر پر ہی علاج ہوتا رہا۔ پھر ہسپتال۔ معلوم ہوا پھیپھڑے ستر فیصد متاثر ہو چکے ہیں۔ وینٹیلیشن پر چلے گئے۔ اوپر سے ڈائریا ہو گیا۔ رہی سہی قوتِ مزاحمت بھی جاتی رہی۔ دماغ کے خلیے جواب دے گئے۔ صرف مصنوعی سانس کا سلسلہ جاری تھا۔ میرے سرجن بیٹے میزان نے مجھے ان کی 'تکنیکی موت' کی سناؤنی دے دی اور بتایا کہ اب بس دو تین روز ۔۔۔ اور پھر ہونی ہو گئی۔ دیکھتے دیکھتے بھائی جان ہمارے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ان کے بیٹے نبیل نے تیمارداری میں دن رات ایک کر دیے۔ وہ دونوں میاں بیوی بھی کرونا کا شکار ہو گئے۔ نبیل کی ساری توجہ باپ کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ ٹھیک سے اپنا علاج تو کجا آرام بھی نہ کر سکا۔ میں نے کہا نبیل بیٹے آپ کے ابو آپ کی صحت یابی کے انتظار میں انتہائی تکلیف دہ حالت میں سانس لیتے رہے۔ آپ کو مکمل طور پر اپنے ساتھ مصروف و متوجہ رکھ کر آپ کی قوتِ مدافعت بڑھاتے رہے اور آخر آخر آپ کو کرونا سے نجات دلا کر خدا حافظ کہہ گئے! اس کی آنکھوں سے جیسے سمندر امڈ پڑا!
ان کی وفات سے بیس پچیس روز پیشتر ہمارے لئے باپ کی حیثیت رکھنے والے سب سے بڑے بھائی لطیف بھائی جان بھی ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ یکے بعد دیگرے دو بھائیوں کی رحلت کا دکھ سینے پر لئے اتنے دن گزر جانے کے باوجود بھی میں جب بھابی زکیہ شفیق، عدیلہ اور حنا بیٹیوں سے فون پر بات کرتا ہوں تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے!

☆☆☆☆☆

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے

"تشبیب" کا فکری، اکتشافی و عددی مطالعہ

قصائد پر مشتمل خالد احمد کا مجموعہ تشبیب جو 1984 میں شائع ہوا، قصائد کے اس مجموعے پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر محترمہ سیدہ آیت گیلانی نے جس قدر باریک بینی اور دانش مندی سے اس مجموعہ کلام پر اظہار خیال کیا وہ یقینی طور پر قابل ستائش ہے۔ ہم سیدہ آیت گیلانی کے اس طویل فکری، اکتشافی اور عددی تجزیے کو قسطوں میں شائع کریں گے تا کہ ادب کے عام قاری تک بھی یہ تنقیدی جائزہ پہنچ سکے۔ [ادارہ]

خالد احمد کے نعتیہ مجموعے "تشبیب" کا فکری، اکتشافی، اور عددی تجزیہ

پہلی سیڑھی

خالد احمد کا دیباچے کو اگر لفظ لفظ کھولا جائے تو نگاہِ فکر کو علم کا بحرِ ذخار معصوم کروٹیں بدلتا نظر آتا ہے۔

اسمِ دوام آپ کا نام
جاہِ رجال شاہِ انام

آپ پہ ہے حُسن تمام
آپ کے لب روحِ کلام
آپ کے بول اوجِ پیام
نانِ جویں رنگِ طعام
تختِ حصیر تاجِ دوام

سیدہ آیت گیلانی

میرے رسول میرے امام
ہر مشکل ہر ہنگام
یاد آئے آپؐ کا نام
جانتا ہے وہ غلام
کب سے ہے آپؐ کا نام
خالد کے صبح و شام

''تشبیب'' کا دیباچہ کوزے میں بند دریا کی طرح ہے۔ بظاہر مختصر ترین لفاظی سے مزین چھوٹی بحر کے مصرعے ہیں۔ مصرعوں کا ہر لفظ فصاحت و بلاغت کی جو رعنائی، گہرائی اور گیرائی سمیٹے ہے وہ الگ سے ایک کتاب کا متقاضی ہے۔ تخیل ارضی نہیں عرشی ہے کیونکہ شاعر نے اپنی بے پناہ عقیدت کا اظہار آیتوں کو منظم کر کے کیا ہے۔

''اسمِ دوام ـــ آپؐ کا نام''

دوام -- ہمیشگی -- اسمِ دوام --- مراد ہمیشہ رہنے والا نام -- کلمہ گو ہی کیا دنیا کا ہر باضمیر محسنِ کائناتؐ کے اسمِ عالی جاہ سے ضرور واقف ہے۔ اس کی شان و شوکت کیا کہنے کہ خدا نے کلمہ و اذان میں ہی شامل نہیں رکھا بلکہ درود کی صورت اسے اپنا وردبنا لیا۔ توضیح و تشریح کا در وا ہونے سے پہلے اس حقیقت کا ادراک ہونا ضروری ہے کہ ارادہ اور چیز ہے اور عطا اور -- ذکرِ شاہِ لولاک ارادے کا محتاج نہیں ہوتا یہ دستِ عطا کا معاملہ ہے۔ نعت لکھی نہیں جاتی نازل ہوتی ہے -- اور نازل وہی ہوتی ہے جس کا تعلق بلندی سے ہو، نور سے ہو یہی وجہ ہے یہ قلب و روح کے دریچوں کو منور کرتی ہے۔ المختصر یہ کہوں کہ نعت بشر خود نہیں لکھتا خدا لکھواتا ہے تو مبالغہ آرائی نہیں ہے -- متذکرہ دیباچے کا پہلا مصرعہ ہی لیجیے -- دو لفظ کائنات کی کنجی ہیں دو مصرعے، پانچ لفظوں پر مشتمل ہیں اور ان پانچ لفظوں میں شاعر نے ہر بات کو، ہر ذات یعنی کل کائنات کو جس طرز سے سمیٹا ہے یہ ان کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

''اسمِ دوام'' گرامر کی رو سے مرکبِ توصیفی ہے جس کے حرف سات ہیں۔ سات کا عدد (7) اپنے دامن میں حیرت انگیز انکشافات چھپائے ہوئے ہے۔ اس کی کارفرمائی عرش تا فرش ہے۔

#خالقِ اکبر نے سات دن میں کائنات بنائی۔

#کائنات میں سات زمینیں، سات آسمان پیدا کیے۔

#زمین کو سات طبقات میں قائم کیا۔

#یہ دنیا سات بڑے ارضی ٹکڑوں پر مشتمل ہے جو براعظم کہلاتے ہیں۔

#ان ٹکڑوں کے سینے پر سات سمندر کروٹیں بدلتے ہیں --

#سورج کو روشنی کی خاطر بنایا اس کی روشنی کے سات رنگ ہیں --

#ان سات رنگوں سے بارش کی پٹی کو سجا کر دھنک کا جلوہ دکھایا۔

#دُبِّ اکبر میں سات ستارے ہیں۔

(دُبّ کے معنی ''ریچھ'' کے ہیں قطب شمالی کے قریب ریچھ نما ستاروں کے جھرمٹ کو دُبّ کہتے ہیں۔ ''بنات النعش، عقدِ ثریا اور ثریا'' اسی کے متبادل نام ہیں تعداد میں یہ سات ہیں)

#سورۃ الحمد کی آیات سات ہیں۔

#سورۃ یٰسین میں مبین سات ہیں۔

خانہ کعبہ کے طواف کی تعداد بھی سات ہے۔

پنجتن پاک کے نام کے اعداد کا حاصل عدد بھی سات ہے۔

محمدؐ 92.....علی ع 110..... فاطمہ 135..... حسن ع 118..... حسین ع.....128.

(7=6+1=16=538=128+118+135+110+92)

#اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کو چراغ ہدایت بنا کر زمیں پر اتارا-- تعداد کا مجموعہ سات ہے۔(7=124)

جنگِ بدر کے اصحاب کی تعداد 313 تھی - عدد کامل سات ہے -

(7=1+3+3)

#قدیم عربی ادب میں مستند قصیدے سات ہیں جو ''سبعۂ معلقہ'' کہلاتے ہیں۔

فقہ جعفریہ کے نزدیک مقاماتِ مقدسہ سات ہیں۔

آخری زمانے میں بوقتِ ظہور آلِ رسولؐ یعنی آخری امام کے ساتھیوں کی تعداد بھی اصحاب بدر جتنی ہوگی۔ یعنی 313.. حاصل عدد سات ہے۔

بطن مادر میں بچہ سات ماہ میں مکمل صورت میں ڈھلتا ہے۔

سات سال میں بچہ باشعور ہوتا ہے۔

ہفتے میں دن سات ہیں۔

فنِ موسیقی میں سُر سات ہیں۔

سائنسدانوں کے مطابق ایک ایٹم کے سات مدار ہیں اور ہر حلقے کے سات مدار چے ہوتے ہیں۔

مخلوق کی عقل کے کرشموں کو ظاہر کرنا مقصود ہوا تو بشر کے دست ہنر سے سات عجوبے بنوادے۔

(تاج محل، دیوار چین، اہرام مصر، ابوالہول، پیسا کا مینار، الوارا اجنتا کے غار، بابل کے باغات)

سبحان اللہ-- جب اسم کی ایک صفت کی کارفرمائی کا دائرہ اس قدر وسیع ہے تو ذات کی صفات کا بیان کیا ہوگا۔ حقیقت یہی ہے کہ مدحیہ شاعری کا کمال معرفت ہے جتنی زیادہ معرفت ہوگی کلام اسی قدر باکمال ہو گا۔ معرفت ہوگی تو دل کے دریچوں پر لطف و سرور کی رم جھم ہوگی اور نگاہ کا محور جمال ہوگا۔

"کلی کی اٹھان"

"اٹھان" عام بول چال میں اس لفظ کو نمو/ بڑھوتری / افزائش کی صورت کے معنوں میں برتا جاتا ہے۔ میں اسے اڑان کی پہلی سیڑھی سمجھتی ہوں "اٹھان" لفظ کو پڑھتے یا سنتے ہی پہلا تاثر جو میرے ذہن میں تفہیم کے پردے پر اپنے نقوش کو جلوہ گر کرتا ہے وہ اسی اڑان کی کہانی سے مشابہہ ہے۔ عموماً اڑان پرواز کے معنوں میں لیا جاتا ہے مگر اس اڑان کو فقط اڑنے کے فعل سے متمسک نہیں کیا جا سکتا سبب یہ کہ ہر فعل سے پہلے کچھ کیفیات، حرکات اور جزئیات ایسی ہوتی ہیں جو معاون کردار ادا نہ کریں تو فعل سرانجام نہیں دیا جا سکتا جیسا کہ اڑان سے پہلے پرندے یا کسی بھی پنچھی کا آسمان کی وسعت پہ نگاہ ڈالنا، پروں کو پھڑ پھڑا کر طوالتِ سفر کے موافق اپنی طاقت کا اندازہ لگانا پر تولنا اور پھر پیچھے قدموں سے جست لگانے کو آگے بڑھنا ___ اُن لمحوں میں پرندہ اپنے آپ کو کس قدر بے بس، بے کس، ناتواں اور حقیر جانتا ہے یہ تو وہی پرندہ جانتا ہے جو وسعتوں والے نیلے آسمان کی طرف آنکھیں موندے، سر جھکائے بڑھ رہا ہو ___ فلک کو چھونے کا یہی جذبہ، یہی ولولہ عشق ہے جو ناممکن کو ممکن کر دکھانے کا جو ہر رگ رگ میں بھر دیتا ہے اور پھر عاشق سوئے فلک بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس ڈر اور خوف کے ساتھ عشق و جذبہ جس قدر صادق ہوگا، جوش و جذبہ اور ولولہ اُسی قدر بلند ہوگا اور اُسے بلندی بخشے گا۔ بشر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے بالخصوص نعت کے تخلیقی لمحوں میں یہاں خواص کی بات مقصود نہیں عاجزوں مسکینوں کو جب دل کی بات کہنی پڑ جائے اور دربار بھی کسی دنیاوی محبوب کا نہیں محبوبِ الٰہی کا ہو تو حالت اُسی پرندے کی سی ہوتی ہے جو اُڑان بھرنا تو چاہتا ہو لیکن رعبِ ہستی اور جلالِ منصب کے سامنے عاجز و مسکین کو بیکسی کا سامنا ہو۔ شوق پرواز کرواتا ہے۔ عشق پروان چڑھاتا ہے۔ شوقِ پرواز میں عشق جتنا بلند کر دے "اٹھان" اتنی ہی عمدہ ہوتی ہے۔

اور جب بات تشبیب کی ہو تو بلا مبالغہ یہ بات بیان کرنا لازم ہو جاتی ہے کہ جب مودت کی زمین پر الہام کی رم جھم ہو تو گلشنِ تخیل میں جو بہار آتی ہے۔ اُسے "تشبیب" کہتے ہیں۔ جس کی شادابی نگاہ عرفان کی بینائی کو تیز کرتی ہے اور جس کا ہر مصرعہ گلِ تازہ کی طرح قلب و ذہن کی وادیوں کو معطر کرتا ہے۔ خوشبوئے نعت عشقِ نبی کو روح کی فضاؤں میں یوں گھول دیتی ہے جیسے رنگ پانیوں میں۔

قلم کی رگوں میں روشنائی نہیں عشق بہتا ہے۔ لفظ قرطاس پر رقم نہیں ہوتے عشق صورت گری کرتا ہے۔

عشق نئی نخن بنتا ہے۔
بندہ عشق کرتا ہے۔
بندہ عشق سنتا ہے۔
بندہ عشق جیتا ہے۔
بندہ عشق ہوتا ہے۔

واہ !! کیا اُٹھان ہے۔ کیا اُڑان ہے۔ محترم خالد احمد نے کیا نصیب پایا ، کیسا مقدر ملا قابلِ رشک ہیں آپ۔۔۔ایک ہی جست میں تمام فاصلے 'تمام' ہوئے۔۔۔
آپ تو عشق میں ڈوبے
اور
عشق ہوگئے۔۔۔۔ سبحان اللہ۔ کیا عطا ہے۔

گلشن   صد   امکاں
ایک   کلی   کی   اٹھان
اک   غنچے   کی   چٹک
لاکھ   چٹکتے   کان

کلی کی معصومیت میں جو حُسن ہے وہ کھلتے گلاب کی دلکشی کا پیش خیمہ ہے اور تشبیب کی "کلی کی اٹھان" اس کے شباب کا پیش خیمہ ہے۔
"گلشن صدامکاں"
گلشن۔۔ باغ، چمن، گلزار
صد۔۔ سو۔۔ ۱۰۰
امکاں۔۔ ممکن ہوسکنا
"سو باتیں" عام بول چال کا کلمہ ہے جس سے مراد مختلف موضوعات پر بہت سی باتیں ہونا ہے۔۔ گلشن دنیا کی علامت ہے جہاں سوطرح کی باتیں ممکن ہیں۔

یہ مسلمہ حقیقت ہی تو ہے کہ دنیا ممکنات کا گھر ہے۔ ماضی ، حال اور مستقبل کو علم وعمل کی دوربین سے دیکھنے اور جانچنے والوں کی نگاہ میں لفظ ناممکن کا وجود ہی نہیں ہے۔ دنیا یا کائنات کو "گلشن" کہتے ہوئے خالد صاحب نے حُسنِ بےمثال کو مجسم کرکے تصور میں ایک تصویر زندہ کردی ہے۔ جس کا ہر رنگ صدائے صد رنگ کے پیچھے چلتا جاتا ہے۔ یہ عرفان بشر کو وقت کے اس پار لے جاکر کھڑا کردیتا ہے جہاں زمین کو قدموں سے اور قدموں کو وجود سے آشنائی نہ تھی۔

سوال سر اٹھاتا ہے کہ یہ عالم مکاں تھا یا زماں؟ عرفان پکار اٹھتا ہے کہ نہ زماں ہے نہ مکاں ہے بلکہ زماں ومکاں کی کثافت سے پاک وہ وقت تھا جب وقت نام کی کوئی شے موجود نہیں تھی۔ شے کیا لاشے بھی نہ تھی۔ نہ آنکھ تھی نہ کوئی دیکھنے والا، نہ کان تھے نہ کوئی سننے والا، نہ بول تھے نہ کوئی بولنے والا، نہ دل تھا نہ کوئی چاہنے والا۔۔۔
ایک آواز ہے فقط ایک آواز۔۔۔۔
نہ سمت، نہ جانب، نہ طرف۔۔۔ دائیں بائیں کا قضیہ تھا نہ مشرق، مغرب، شمال، جنوب کا جھگڑا۔۔۔
آواز ہے اور چار سُو ہے۔۔۔

ارادے بتاتی ہوئی، اعلان کرتی ہوئی، حکم سناتی ہوئی، حکم منواتی ہوئی--
آواز لفظوں کے لبادے اوڑھتی ہے، بے رنگ لبادے-- پھر بے رنگی سے معانی رنگ بن کر پھوٹتے ہیں اسم اور معانی کے صدقے آن کی آن میں ''کن'' سے ''فیکون'' کا سفر طے ہو جاتا ہے- معانی اسرار میں پلٹتے، ارادوں کے پیرہن بدلتے ممکنات میں ڈھلتے ہیں، معنی کسی قوی، قدیر، قائم کے ارادوں کے گلاب بن کر کھلتے ہیں -- گلابوں کے رنگ خوشبو بن کر بکھرتے ہیں- رنگ بکھرے تو لاشے سے شے نے جنم لیا، رنگ راہ گزر بنے، رنگ منظر بنے، رنگ شجر بنے، رنگ حجر بنے-- الٰہی رنگوں سے حرف پھوٹے، حرف لفظوں میں ڈھلے، لفظوں کو لہجہ ملا، لہجے کو لحن داؤدی عطا ہوا، لحن بیان میں ڈھلا اور اعلیٰ بیان کی خاطر الانسان کو رحمٰن سے قرآن ملا- نعمتوں سے ''گلشنِ جہاں'' کو رعنائی ملی. خالق اکبر نے اس کائنات کو بطنِ حرکت سے پیدا کر کے لغتِ حیات سے ناممکن کا لفظ مٹا کر قیامت تک کے لیے قانون طے کر دیا جو کچھ بھی ہے دست کاوش میں پنہاں ہے-
''کلی کی اٹھان''--- پہلا قدم آغاز سے انجام تک کے سفر کا پیغام ہے-- ازل تا ابد کی لفظی تصویر شاعر نے کسی ماہر مصور کی طرح تخیل کے پردے پہ اتار کر جس چابکے سے یہ پیغام سوچ کے سپرد کیا ہے کہ جو بنا ہے، مٹنے کے لیے بنا ہے- چاہے وہ تخت نشیں ہو چاہے خاک نشیں انت سب کا فنا ہے، نہایت قابل داد ہے- ہر ذی وجود کے افسانے کا انجام فنا جیسا کہ سورۃ الرحمٰن کی پکار ہے
کل من علیھا فان ------- ہر شے کو فنا ہے-
''پھول'' حیات کے نمائندے اور ''گلچیں'' فنا کے ہاتھ یا موت کی علامت ہیں- روح گلاب سی معطر ہی کیوں نہ ہو آخری منزل موت ہے-- یعنی پلٹ کر اسی کی جانب ہی جانا ہے جو ہر جانب سے بے نیاز ہے--- جو باغباں بھی خود ہے گلچیں بھی خود--- اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے وہ رحمٰن بھی ہے اور قہار بھی--
''گلچیں کا دامن''---- دامن کا بدن سے انتہائی قربت کا رشتہ ہے- یہ اس قدر قریب کہ حدت و لمس کے تغیر کا پل پل گواہ ہے- روح دامن میں جا بسے گی-- یعنی جز، کل میں جا ملے گا-- جب سب ایک ہی ہونا تو پھر اس باغ کو سجانے کی علت کیا تھی؟

خود ہی مارو
خود ہی جیون دان کرو جی--
ساری باتیں بھید بھری
کچھ کر پا آن کرو جی---

(جاری ہے)

تڑکا لگی کہانی

اسلام عظمی

نشیب میں اُترتے وقت اُنھوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ رستہ بھی بھول سکتی ہیں۔ چھوٹی کا بچپن اِنھی راستوں میں گزرا تھا۔ وہ اُترائی اور چڑھائی کے گن جانتی تھی۔ اُس کا باپ جنت نظیر کشمیر چھوڑ کر لاہور نہ گیا ہوتا تو اُس کی باقی عمر بھی اِنھیں راستوں کے اُتار چڑھاؤ میں کٹ جاتی۔ مگر پاپی پیٹ بھرنے کے لیے کئی ناٹک رچانے پڑتے ہیں۔ کشمیری قیامِ پاکستان سے پہلے قسمت آزمائی کے لیے امرتسر یا لاہور کا رُخ کرتے۔ وہاں والے اُنھیں ''ہاتو'' کے لقب سے جانتے اور پکارتے۔ سال دو سال کے بعد ہاتو کچھ ماہ وطن میں گزارتے۔

چھوٹی ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اُس کی ماں اللہ کو پیاری ہوگئی۔ سیدھے سادے لوگوں کو یقیں تھا کہ یہ دنیا دُکھوں کا گھر ہے۔ اس لیے وہ ہر مرنے والے کو اللہ کا پیارا سمجھتے۔ باپ بیٹی کو اپنے ساتھ داتا کی نگری میں لے آیا۔ پھر مرنے سے پہلے باپ نے بیٹی کی ذمہ داری مالک کو سونپ دی۔ گھر والے اُسے چھوٹی کے نام سے پکارنے لگے۔ نوکرانیاں اللہ کی وہ مخلوق ہوتی ہیں

جنھیں نام کی ضرورت نہیں پڑتی۔ زندگی انھیں ایسی خوشی بے نامی میں گزار دیتی ہے۔
چھوٹی کا ان داتا اور اس کی مالکن شہزادی کا باپ لاہور کے پوش علاقے میں منتقل ہونے سے پہلے اپنی دُکان کے اُوپر کے چھوٹے سے کمرے میں بطور کرایہ دار بمعہ اہل وعیال رہتا تھا۔ جب چار پیسے ہاتھ میں آئے تو وہ لاہور کے پوش علاقے میں شفٹ ہو گیا۔ یہ وہ دن تھے جب لاہور لہور تھا۔ لاہوریا کہلانے کے لیے ٹرین میں بیٹھ کر لاہور کے ریلوے سٹیشن پر اُتر جانا کافی تھا۔ ٹکٹ کے ساتھ اُترا ہے یا بلاٹکٹ' یہ ریلوے والوں کی سردردی تھی۔ اور سردردی کے لیے "اسپرو" جو تھی۔ جس کے پاس وسائل ہوتے وہ ٹکٹ کٹا کر لاہور چلا آتا۔
پنجاب اور پنجاب سے باہر والے بھی دکانوں کے لیے مال خریدنے کے لیے لاہور آتے۔ داتا دربار پر حاضری دیتے اور شاہ عالمی پہنچ جاتے۔ وہیں سے دائیں بائیں گلیوں سے گزرتے اور سامان خرید کر شیرانوالا گیٹ سے نکل کر بس پکڑ لیتے۔ ٹرین سے جانا ہوتا تو بھی وہاں سے تانگہ مل جاتا۔ سستا زمانہ تھا بندے سیدھے سادے۔ سیانے بندے دنوں میں سیٹھ کہلانے لگتے مگر اس سے کچھ فرق نہ پڑتا کہ پانی والے تالاب کے پاس ٹوگزے کی قبر تھی۔ ٹوگزوں کی موجودگی میں ڈیڑھ پونے دوگزوں کو کون پوچھتا!
تو چھوٹی نوکرانی تھی اور شہزادی مالکن۔ چھوٹی کا زیادہ تر وقت شہزادی کے ساتھ گزرتا مگر عجیب کھپلا ہو گیا تھا۔ چھوٹی نوکرانی تھی مگر نوکرانی لگتی نہیں تھی اور شہزادی مالکن تھی مگر مالکن لگتی نہیں تھی۔ دونوں ہم عمر تھیں۔ انھیں سہیلیاں بننے میں دیر نہیں لگی۔ نادانی کی عمر تھی۔ دونوں نہیں جانتی تھیں کہ سہیلی پنے کا رشتہ کتنا بھی مضبوط ہو' ذرا سے کھچاؤ سے ٹوٹ جاتا ہے۔
خیر..... نشیب میں اُترتے وقت دونوں مطمئن تھیں۔ رستہ کوئی تھا نہیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں سے کبھی کوئی انسان گزرا ہی نہیں۔ وقفے وقفے سے اُنھیں رستہ خود بنانا پڑ جاتا۔ رستہ بھولنے کا ڈر نہ تھا کہ شہزادی کے پاس نئے ماڈل کا موبائل تھا جو سمارٹ بھی تھا اور بطور ٹارچ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اُس کے جی آر پی (GRP) کی مدد سے وہ واپسی کا رستہ باآسانی ڈھونڈ سکتی تھیں۔ دو باتوں کی طرف مگر اُن کا دھیان نہیں گیا تھا۔ ایک تو یہ کہ اُترائیوں میں اُترنے کے بعد سگنل کہیں بھی اور کبھی بھی غائب ہو سکتے تھے۔ دوسرے یہ کہ سمارٹ موبائل کی بیٹری بھی جواب دے سکتی تھی۔ جی آر پی سگنلوں کی

عدم موجودگی میں مدد نہیں دے سکتا تھا۔ شہزادی جگہ جگہ رُک کر ویڈیو بنانے لگتی۔ واپس لاہور پہنچ کر وہ یہ ویڈیو کلپ سہیلیوں کو دکھا کر مرعوب کرنا چاہتی تھی۔ .....

''شہزادی' اب ہمیں اَب واپس چلے جانا چاہیے''..... چھوٹی بار بار یاد دہانی کراتی۔

''کیوں ؟''..... شہزادی تنگ کر جواب دیتی۔ غروب میں پورا گھنٹہ پڑا تھا۔ پندرہ بیس منٹوں میں وہ یہاں پہنچ گئی تھیں۔ واپسی کے لیے بھی تو پندرہ منٹوں کی ہی ضرورت ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُتار اور چڑھاؤ کا کھیل سمندروں ہی میں نہیں' معاشروں میں بھی ہوتا ہے۔ وہ شاہ عالمی کی دُکان کے اُوپر کے چھوٹے سے کمرے میں پیدا ہوئی تھی مگر ہوش اُس نے ایک کنال کی کوٹھی کے لان میں سنبھالا تھا۔ کچھ بھی' کہیں بھی' کبھی بھی ہو سکتا ہے۔

اپنی تسلی کے لیے وہ بار بار گھڑی پر نظر ڈال لیتی۔ سورج کے غروب ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا کہ چاروں طرف اندھیرے کی چادر تن گئی۔ دونوں کے لیے ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے''..... شہزادی نے پہلی بار اعتراف کیا۔

.....

چھوٹی نے حوصلہ بڑھایا: ''شہزادی صاحبہ' ڈر ور کچھ نہیں ہوتا۔ ڈر انسان کے اندر ہوتا ہے۔ آپ کو فلم شعلے کا وہ ڈائیلاگ یاد نہیں جس میں گبھر سنگھ کالیے کو مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ جو ڈر گیا وہ مر گیا۔ ڈرنا نہیں۔ میں ہوں ناں''..... شہزادی کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی شہزادی کے پاؤں کسی انسانی جسم شے سے ٹکرائے۔ وہ چلائی:

''چھوٹی مر گئے۔ میرے قدم کسی انسانی جسم سے ٹکرائے ہیں' جو کوئی مردہ جسم لگتا ہے..... ٹھنڈا ٹھار۔'' چھوٹی نے موبائل کی لائٹ آن کرنے کا مشورہ دیا۔ ایک وجیہہ آدم زاد اُن کے قدموں میں پڑا تھا۔ اُس کے سارے جسم پر سوئیاں سی گڑی تھیں اور وہ نیم مردہ۔ چھوٹی نے جھک کر اُسے چھوا اور اعلان کیا:

''مالکن' یہ تو کوئی آدم زاد ہے جس پر جادو کیا گیا ہے یا پھر نشے میں دھت کوئی آدمی!''

چھوٹی کو بچپن میں اپنی نانی کی سنائی ہوئی کہانیاں یاد تھیں جن میں جادوگرنیاں ضدی شہزادوں کے جسموں میں منتر پڑھی ہوئی سوئیاں گاڑ دیتی تھیں۔ سوئیوں کے نکالنے تک وہ مردہ ہی دکھتا ہے۔ سال دو سال کے بعد وہ سوئیاں نکال کر چیک کرتیں کہ شہزادے اپنی ضد چھوڑی ہے کہ نہیں..... ''نہیں'' کی

صورت میں وہ سوئیاں پھر سے اُس کے جسم میں گاڑ دیتیں۔

''سوئیاں گڑا جسم سوئیوں کے نکالنے تک زندہ رہتا ہے' چاہے صدیاں گزر جائیں۔ اِس کے جسم سے سوئیاں نکال دی جائیں تو یہ پھر سے جی اُٹھے گا۔''

''پھر تو یہ کام نیکی کا ہے۔ سوئیاں نکالنے پر ایک تو یہ جی اُٹھے گا۔ دوسرے ہمارا ٹائم بھی پاس ہو جائے گا۔ چلو شروع ہو جاؤ''..... شہزادی نے چھوٹی کو حکم دیا۔ چھوٹی ایک تو چھوٹی ذات کی تھی پھر اُس کا قد کاٹھ بڑھ نہیں پایا تھا۔ چھوٹی کا لقب اُس پر خوب فٹ بیٹھتا تھا۔ چھوٹی ساری رات شہزادے کے جسم سے سوئیاں چنتی رہی۔ صبح ہونے کو آئی تو اُسے جنگل جانے کی حاجت محسوس ہوئی۔ باقی کی سوئیاں اُکھاڑنے کا کام اُس نے شہزادی کے سپرد کیا اور خود جنگل کے لیے چلی گئی۔ جنگل جانا' دیہات میں رفع حاجت کی ضرورت کے پورا کرنے کو کہا جاتا تھا۔ چھوٹی درختوں کی اوٹ میں چھپ کر آسودہ ہوئی۔ پھر چشمے کے بہتے پانی سے خود کو صاف کیا۔ سورج پہاڑیوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا تھا۔ اُس نے نشیب میں جمع ہونے والے پانی سے اپنا چہرہ دھویا تو اُس کا رنگ نکھر آیا۔ اِس اثنا میں شہزادی نے آخری سوئی بھی اُکھاڑ لی۔ آخری سوئی کے نکلتے ہی شہزادہ جاگ اُٹھا۔

''شہزادی کہاں ہے؟''..... اُس نے پوچھا۔

''میں ہی شہزادی ہوں۔''

''جھوٹ مت بولو''..... شہزادے نے کہا: ''دادی جو کہانی سنایا کرتی تھی۔ اُس میں شہزادی آخری وقت میں جنگل کی طرف چلی جاتی ہے۔ آخری سوئیاں باندی چنتی ہے۔ تم شہزادی نہیں ہو' باندی ہو۔ شہزادی کہاں ہے۔''

''میں ہی شہزادی ہوں۔ کوئی شک ہے تو میرا شناختی کارڈ دیکھ لو''..... اُس نے اپنا پرس کھولا تو یاد آیا کہ شناختی کارڈ تو وہ لاہور ہی میں بھول آئی ہے۔ شناختی کارڈ کی ضرورت بھی نہیں تھی کہ وہ اتنی بڑی گاڑی میں بیٹھے ہونے کے بعد کہ کوئی پاگل ہی اُس سے اُس کی شناخت کا پوچھ سکتا تھا۔

''سوئیاں کہاں ہیں؟''..... شہزادے نے جاننا چاہا۔

شہزادی نے سوئیاں اُسے دکھانے کے لیے اُدھر دیکھا مگر اُسے کہیں کوئی سوئی دکھائی نہیں دی۔ اُس کا دھیان اس بات کی طرف گیا ہی نہیں تھا کہ سوئیاں پھینکنے کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہیں۔ اتنے میں چھوٹی بھی واپس آن پہنچی۔ شہزادے نے اُسے دیکھا تو دنگ رہ

گیا۔ ان ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہُوا یوں کہ رات بھر میں شہزادی کا میک اپ اُتر گیا تھا اور اُس کی اصل شکل نکل آئی تھی۔ دوسری طرف دُھل کر چھوٹی کا رنگ نکھر آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر شہزادہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ آئی میری شہزادی۔"

"شہزادے، شہزادی وہی ہے جو تمھارے پاس بیٹھی ہے۔ میں چھوٹی ہوں، نوکرانی۔"

"بکواس مت کرو"...... شہزادے نے گرج کر کہا: "یہ باندی ہے اور تم شہزادی۔ بڑی ماں کی کہانی مجھے یاد ہے۔ سوئیاں اُکھیڑنے کے آخری مرحلے میں شہزادی جنگل چلی جاتی ہے اور شہزادہ باندی کو شہزادی سمجھ لیتا ہے۔ میں اتنا ہونق نہیں ہوں اور کھرے کھوٹے کی پہچان نہ کر سکوں۔ ابھی محل میں چلتے ہیں۔ وہاں پہنچتے ہی سچ جھوٹ کا نتارا ہو جائے گا۔"

"تم کس محل کی بات کر رہے ہو۔ یہاں تو سیکڑوں کوس تک کوئی محل نہیں۔ تم نگلیات میں ہو۔ ابھی ساتھ اُوپر چلو اور ناشتہ کرو۔ ناشتے کے بعد تم ہمارے ساتھ گھوڑا گلی چلو گے، جہاں ہم تمھیں گھوڑے اور گدھے کی پہچان کروائیں گی۔"

"یا اللہ یہ کیا ہو گیا ہے؟"...... شہزادے نے اپنا سر تھام لیا۔

چھوٹی کچھ سوچتے ہوئے بولی: "لگتا ہے کہ بیچارہ صدیوں تک سویا رہا ہے۔ مشکل یہ ہوئی ہے کہ اُکھاڑی ہوئی سوئیاں غائب ہو گئی ہیں۔ ورنہ سوئیوں کی ساخت سے پتا چل جاتا کہ وہ "میڈ اِن تائیوان ہیں" یا "میڈ اِن چاینا"۔ ثبوت کے بغیر آکو بیچر والا بھی ہماری کہانی پر یقین نہیں کرے گا۔ یقین کے لیے بیانِ حلفی کی ضرورت ہوتی ہے، چاہے وہ جھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔"

"شہزادی" آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں ہندی ہوں ہندی۔"

ہندی کے نام پر شہزادی چھٹی حس جاگ گئی۔ "برتھ سرٹیفکیٹ ہے آپ کے پاس"...... وہ پوچھنے لگی: "اَرے میاں، اَب تو ہند میں خود کو ہندی کہلوانے اور منوانے کے لیے برتھ سرٹیفکیٹ کا ہونا ضروری ہے۔ وہاں کے عوامی نمائندوں نے اکثریت کے ساتھ یہ قانون پاس کیا ہے۔ ہندی کہلانے کے لیے جنم پتری پاس ہونا ضروری ہے۔ شکر کرو کہ تم اِس وقت پاکستان میں ہو۔ ہندوستان میں ہوتے تو تمھیں چل پتا جاتا۔"

"تم دونوں یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟"...... شہزادی چلائی۔ ساتھ ہی بھوک اور مشقت سے پیدا ہونے والی نقاہت سے لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔

"یا اللہ یہ کیا ہو گیا ہے؟"...... شہزادہ چلایا:

''شاہی طبیب کو خبر کرو۔''

چھوٹی بولی: ''شہزادے! ایسا لگتا ہے کہ تم وقت سے کئی صدیاں پیچھے رہ گئے ہو۔ اَب ویدوں اور حکیموں کا زمانہ نہیں۔ یہ ڈاکٹروں کا زمانہ ہے۔ اَبھی ہم واپس چلتے ہیں اور شہزادی کو کسی ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں۔''

''یہ کون سی ریاست کی شہزادی ہے؟''

چھوٹی کا بہت کچھ کہنے کو جی چاہا مگر کہتے کہتے رُک گئی۔ کچھ سوچا پھر کہا:

''یہ ریاستِ پاکستان کی شہزادی ہے۔ دشمن بھلے کچھ بھی کہیں مگر ہماری ریاست کی رٹ ابھی تک قائم ہے اور اِن شاء اللہ قائم رہے گی۔ چھوٹی موٹی مہنگائی اور تکلیفیں اِس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں۔ اَدھ موئے لوگ تھوڑا چیختے چلاتے ہیں پھر چپ سادھ لیتے ہیں۔ سارا مقدر کا کھیل ہے۔ بچی کھچی توانائی کو فضول میں ضائع کیوں کرنا! مگر اُوپر جانے سے پہلے شہزادی کو ہوش میں لانا ضروری ہے۔''

''نلکہ ہوتا تو سونگھا دیتے پل میں ہوش آجاتا۔''

چھوٹی کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ ''نلکہ'' کیا ہوتا ہے۔ ''نلکہ'' اور ''لکھ لکھا'' کی بحث میں پڑنے کے بجائے اُس نے کہا کہ چشمے کے پاس بہت پھول کھلے ہیں۔ پھول لاتے ہیں اور سونگھا کر شہزادی کو ہوش میں لاتے ہیں۔ شہزادے نے اُس کی بات کے ساتھ اتفاق نہیں کیا۔ اتفاق فاؤنڈری کے قضیے کی وجہ سے لوگ ''اتفاق'' کے بجائے ''نفاق'' کی برکتوں کے قائل ہو چکے تھے۔ شہزادے کا بتایا کہ مہابھارت کے دنوں میں ایک راجکماری نے شادی سے پہلے ایک دیوتا کے کہنے پر غلطی سے پھول سونگھ لیا تھا اَور اُس کا پاؤں بھاری ہو گیا تھا۔

''تو کیا وہ سنگل پیرنٹ (Single Parent) بن گئی تھی؟''

شہزادے کو چھوٹی کی بات کی سمجھ نہیں آئی اور وہ ہونقوں کی طرح اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ شہزادی نے خود کو کچھ سنبھالا اور کہنے لگی:

''پھول سونگھانے کے بجائے اِس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہیں۔''

چھوٹی نے ایک پودے کے بڑے پتے کا ڈونگا بنایا اَور اِس میں پانی لا کر شہزادی کے چہرے پر چھڑکا تو وہ ہوش میں آگئی۔ شہزادہ اُسے ''باندی'' کہہ کر پکارنے ہی والا تھا کہ چھوٹی نے اُسے روک دیا۔ ''اُوپر پہنچنے تک تم اپنا تھوبڑا بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔ شہزادی غصّے کی بہت تیز ہے۔ وہ میری چھٹی بھی کرا سکتی ہے۔ اور تمھارے پاس تو رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا بھی نہیں۔''

''ابا حضور' یہ نا انصافی نہیں ہونے دیں گے۔ وہ بھی بہت کچھ کروا سکتے ہیں؟ انگریز دربار میں اُن کی بہت پہنچ ہے - بہت بااختیار ہیں وہ''..... شہزادے نے کہا۔

''اُنھوں نے کیا غنڈے پالے ہوئے ہیں''..... چھوٹی کہتے کہتے رُک گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شہزادہ دو دنیاؤں کے درمیان اٹکا ہوا ہے۔ اُوپر جائے گا۔ باسی نان کھائے گا تو سارا نشہ اُتر جائے گا۔

شہزادی کے سیٹھ باپ نے شور شرابے سے دور یہ گھر بنوایا تھا۔ جہاں سے ناشتہ لینے کے لیے بھی ڈرائیور کو گاڑی دے کر بھیجنا پڑتا تھا۔ اُنھیں لاہور سے آئے دو دن ہو چکے تھے اور ابھی تک لاہور سے لائے ہوئے نان کبابوں سے ناشتہ ہو رہا تھا۔ سیٹھ صاحب کسی ضروری کام سے ڈرائیور کو لے کر نکل گئے تھے اور شام سے پہلے اُن کی واپسی نہیں ہونے والی تھی۔

.....

چڑھائی چڑھ کر گھر تک پہنچتے پہنچتے سورج سر پر آ چکا تھا اور وہ تینوں تھکن سے چور ہو چکے تھے۔ نامعلوم وقت تک سوئے رہنے اور پھر کھانے کے لیے کچھ نہ ملنے کی وجہ سے شہزادے کی بولتی بند ہو چکی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ گھر میں بجلی آ رہی تھی۔ شہزادی نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا موبائل چارجنگ کے لیے لگایا اور اپنے بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ شہزادہ صوفے پر بیٹھتے ہی سو گیا۔

چھوٹی نے چولھا جلایا۔ نان اور کباب گرم کر کے ڈائننگ ٹیبل پر سجا کر دونوں کو جگایا۔ شہزادی کے بالمقابل بیٹھ کر شہزادے کو خیال آیا کہ چھوٹی کو بھی کہے کہ وہ بھی اُن کے ساتھ بیٹھ جائے مگر سامنے بیٹھی ''باندی'' کے ڈر سے کچھ نہیں بولا۔ مفلسی کے ساتھ بھوک بھی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے۔ سو شہزادے نے کھانے پینے موج اڑانے اور کچھ نہ بولنے ہی میں عافیت سمجھی۔ ویسے بھی وہ اور اُس کے بڑے ایسا ہی کرتے آئے تھے۔ وہ گھر کی آرائش دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اُس کے باپ کا محل تو اِس کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھا۔ ماضی پر مٹی ڈالتے ہوئے اُس نے چپ ہی میں عافیت جانی۔ ویسے بھی شہزادی غسل خانے سے آراستہ ہو کر باہر نکلی تھی تو خاصی شہزادی لگ رہی تھی۔ شہزادے کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ اُس کے اتالیق نے بتایا تھا کہ بابر بادشاہ کا وتیرا تھا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ شہزادے نے عالم

دوبارہ دیکھ لیا تھا۔ پچھلے چھ سات گھنٹوں میں اُس نے کئی بار خود کو چٹکی کاٹ کر یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ کہیں وہ حالتِ خواب میں تو نہیں۔ جو ہوا سو ہوا' "مٹی پاؤ" سوچ کر وہ پھر سو گیا۔

....

ڈٹ کر سونے کی وجہ سے چھوٹی کے جسم کا انگ انگ دُکھ رہا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ کھانے کے لیے کچھ نہیں ملا تو شہزادی تو اُس کا جینا حرام کر دے گی۔ انگڑائی لے کر تھکن کو دور بھگایا اور کچن میں جا کر دوپہر کا کھانا بنانے کے لیے فرج کھولا۔ پکانے کے لیے کچھ خاص نہ تھا۔ کوئی دو کوس کی چڑھائی پر کریانے کی دُکان تھی اور کھانے کا سامان وہیں سے مل سکتا تھا۔ شہزادی کو بن بتائے وہ سامان خریدنے نکل پڑی۔ چڑھائی چڑھ کر وہ سڑک تک ہی پہنچی تھی کہ ایک ویگن نے اس کے قریب پہنچ کر بریک لگائی پھر کسی نے پوچھا:

"طیبہ، یہاں کیا کر رہی ہو؟"

طیبہ چھوٹی کا سکول کے دنوں کا نام تھا۔ چھوٹی نے نظریں اُوپر اُٹھائیں۔ برسوں کے بعد بھی اُس کی ٹیچر زرین کا چہرہ ویسے کا ویسا تھا۔ پرائمری سکول میں "سائیکالوجی" کے مضمون کی گنجائش نہیں تھی مگر دوسری ساری ٹیچر اُسے "سائیکولوجسٹ" مس کہہ کر پکارتی تھیں۔

"شہزادی کے ساتھ یہاں آئی ہوئی ہوں"

......چھوٹی نے ڈھلوان میں اپنے شاندار گھر کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ ہم وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

"کیا ہم وہاں مُنہ ہاتھ دھو سکتے ہیں؟"

...... زریں نے چھوٹی سے پوچھا۔ چھوٹی نے کچھ سوچ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ٹیچر اور لڑکیوں کو اپنے پیچھے آنے کا کہا اور خود تیز تیز چلتی ہوئی گھر پہنچ گئی۔ شہزادی ابھی خراٹے بھر رہی تھی۔ اوپر تین بیڈ روم تھے۔ ایک میں شہزادہ سویا ہوا تھا۔ چھوٹی انھیں اوپر لے گئی۔ شہزادے والے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس نے سب کو اونچی آواز میں بولنے سے منع کیا۔

....

"آپ لوگ تھکن اُتاریں۔ میں پھر اُس دُکان سے ہو کر آتی ہوں' جہاں ہم ملے تھے۔"

"وہاں کیا کرنے جانا ہے؟"

"دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ سامان لانا ہے۔"

"اس کے لیے تمھیں جانے کی ضرورت نہیں۔ گاموں کو بولتے ہیں۔ وہ سب خرید لائے گا۔ پھر بتایا کہ وہ اِسی علاقے کا

رہنے والا ہے۔ ہم جس ویگن میں لاہور آئے تھے اُس کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہوگئی تھی۔ ہمارے ڈرائیور نے گاموں کی گاڑی لے دی۔ گاموں ہمارے ڈرائیور کا جاننے والا ہے“۔ گاموں کو ایک کام یاد آ گیا تھا اور وہ چلا گیا تھا۔ اُس کے آنے میں دیر تھی۔ کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ چھوٹی زرین کو رات کی سرگزشت سنانے لگی۔ زرین نے ساری بات سُنی اور کہنے لگی: ”بادی النظر میں تو یہ دوہری شخصیت کا کیس ہے۔ مگر تم جو یہ بتا رہی ہو کہ وہ نشیب میں پڑا تھا اور اس کے سارے جسم میں سوئیاں چبھی ہوئیں تھیں۔ اُٹھنے کے بعد سوئیوں کا غائب ہو جانا‘ بات کو پراسرار بنا دیتا ہے۔ تم دونوں اِس واقعے کی شاہد ہو‘ اِس لیے تمھاری باتوں کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ تم دونوں کہاں سے نشیب میں اُتری تھیں؟“

زریں کو ٹیرس میں لے جا کر چھوٹی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اُس ڈھلوان کے بارے میں بتایا جہاں سے وہ نیچے گئیں تھیں۔ وہ اور آس پاس کے چھے سات گھروں کے رہائشی بھی یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ سال میں دو چار بار چند ہفتے یہاں گزارتے تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ پہاڑی مقام صحت افزا ہوتے ہیں مگر اُن لوگوں کے لیے جو یہاں کچھ عرصہ کے لیے آتے ہیں۔ مقامی لوگوں پر یہاں کی آب ہوا کچھ خاص اثر نہیں ڈالتی۔ بلند پیڑوں کے قدموں میں کئی انواع کے پودے تھے۔ چھوٹی نے ایک سمت اشارہ کرتے ہوئے بتایا:

”مجھے یاد ہے کہ بچپن میں نے کسی سے سنا تھا کہ یہاں جا بجا جنگلی دھنیے کے پودے ہوتے ہیں۔ یہ دھنیا ڈالنے سے سالن سوادی ہو جاتا ہے۔ رات دھنیا ختم ہو گیا تو میں جنگلی دھنیے کے پتے چن لائی اور سالن میں ڈال دیے۔“

”کیا!“......زریں نے واقعات کی کڑیاں آپس میں ملائیں اور پھر کچھ سوچ کر بولی:

”کیوں نہ ہم اُس بونگے شہزادے پر ایک نظر نہ ڈال لیں۔“

چھوٹی اُسے شہزادے والے کمرے میں لی گئی مگر بیڈ خالی تھا۔ زریں نے جھک کر بیڈ کی چادر کو دیکھا۔ کہیں بھی کوئی سلوٹ نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ برسوں سے کوئی اس کمرے میں داخل نہیں ہوا۔ زریں نے ہاتھ سے اپنی پیشانی تھام لی: ”چھوٹی‘ سالن میں دھنیے کی جگہ کہیں تم نے بھنگ کے پتے تو نہیں ڈال دیے تھے!“

☆☆☆☆☆

میزبان

شہر سے بھاگ جانے کا ارادہ کئی سالوں سے اس کے اندر پنپ رہا تھا۔ گھر اور اسکے تمام افراد اُسے قابل رحم، محروم اور مفلس رکھنے میں جتے ہوئے تھے۔اس کے دونوں بڑے بھائی صرف عمر کے لحاظ سے بڑے تھے۔ انہیں بڑا بننے کا ڈھنگ نہیں آیا تھا۔ یہی حال اس کے باپ کا بھی تھا۔ بس وہ باپ ہونے کے رتبے کی وجہ سے معاشرے میں اپنے تئیں خود کو بلند تر سمجھنے لگا تھا۔ عادل کو کتابیں پڑھن کا شوق تھا۔ چند کتابیں پڑھنے کے بعد اُسے یوں لگا تھا جیسے وہ اپنے دوستوں میں سب سے الگ ہے۔ ایف۔ ایس سی میں فیل ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ایسی غیر نصابی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ جس کی وجہ سے اُسے رشتے، رتبے اور دُنیاداری کی سمجھ آنے لگی تھی۔ اساتذہ کو اس کے ذہن اور حساس ہونے کا یقین تھا۔ اسی لیے سب نے اس کے فیل ہونے کا افسوس بھی کیا۔ آگے پڑھنے کا ارادہ نہیں بن رہا تھا۔ زندگی میں آوارگی ، بے غمی اور غیر منصوبہ بندی کے حسن نے اُسے مسرت سے ہم کنار کرنا شروع کر دیا تھا۔ رات اور دن کے ڈھل جانے کا خوف جو اُس کے ماں، باپ، بہن بھائیوں اور دوستوں میں تھا وہ اُسے آزاد ہو چکا تھا۔ صبح دس بجے سے گیارہ بجے تک وہ بالے کے ہوٹل میں بیٹھ کر اخبار پڑھتا رہتا۔ ہوٹل کے لوگ اور آنے جانے والے لوگ اُس سے مانوس ہو چکے تھے۔ ہوٹل کا مالک بالا اُس سے چھوٹے موٹے کام بھی کروانے لگا تھا۔ جسے وہ خوشی خوشی انجام دے لیتا۔ بجلی گیس کے بل گاہکوں کے اُدھار اور دیگر اخراجات کا حساب کتاب بھی بالا اُسی سے کروالیتا۔ بالا اُسکی عزت کرنے لگا تھا۔ اُس نے پرکھ لیا تھا کہ جوانی

کلیم خارجی

کی دہلیز پہ کھڑا یہ لڑکا اپنے نام کا عادل ہی نہیں بلکہ اپنے رویے اور معاملات میں بھی عادل ہے۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ زندگی، جسم اور پیٹ کی وہ ضروریات جو پسماندہ تعصبات اور جارحیت کے شکار معاشرے میں جن لوگوں کو ستائے رکھتے ہیں۔ عادل اُن سے بے نیاز اور پاک ہے کیونکہ اسکے کردار میں لالچ، خوشامد اور جنسی جذبے کی تسکین کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ بالے نے اسے ایک دن خوش ہوکر یہ کہہ بھی دیا تھا۔

"یار عادل تم میں جو، لیاقت، شرافت اور جو خوبیاں ہیں وہ بڑے لوگوں کی ہیں۔ اگر تم اس جاہل معاشرے میں غریب، بزدل اور بے حیثیت گھرانے میں نہ پیدا ہوتے۔ تو تم یقیناً بہت ہی بڑے اور خوشحال ترین آدمی ہوتے۔ یہاں کیا کر رہے ہو اس شہر سے کہیں نکلو اپنے لیے کچھ کرو۔ اپنی لیاقت کے مطابق دُنیا میں لوگ اور موقعے تلاش کرلو۔ بالے کی یہ بات اُسکی ذہن میں اُتر گئی۔ اور وہ جیسے بہت گہری نیند سے بیدار ہوگیا تھا۔ چنانچہ اُس نے اخبار میں نوکریوں کے اشتہار دیکھ کر درخواستیں بھجوانا شروع کردیں۔ چند ماہ کے بعد اُسے ایک خط موصول ہوا یہ اُردو کا ٹائپ شدہ خط تھا۔ ایگل ٹائیرز کمپنی والوں کی طرف سے اُسے بلاوا تھا۔ عادل نے اپنے بزرگ اور دوست بالے سے مشورہ مانگا تو بالے نے خوشی سے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا،

چلے جاؤ سرکاری اور غیر سرکاری نوکری اس معاشرے میں، بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن تمہیں اس شہر سے نکل کر اپنی شخصیت بنا کر وسیلے ڈھونڈنے کا موقع مل رہا ہے۔ نکل جاؤ کرایہ مجھ سے لے کر جانا۔

ہری پوری میں اُترتے ہی عادل کو نئی جگہوں اور نئے راستوں کی وجہ سے دھوپ، چھاؤں میں ایک نیا پن اور خوبصورتی کا احساس ہونے لگا۔ ایگل ٹائیرز شہر کی سب سے مشہور اور بڑی دُکان تھی۔ سب لوگ جانتے تھے وہ اپنے وقت سے کئی گھنٹے پہلے پہنچ چکا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے اُس نے ایگل ٹائیرز کی دُکان ڈھونڈی۔ وہ بند دُکان کے دروازے، اس کے بل بورڈ، فون نمبر، اشتہارات دیکھتا رہا۔ کھڑے کھڑے اس کو احساس ہوا کہ وہ اجنبی اور بے وسیلہ ہونے کے خوف سے آزاد ہو چکا ہے۔ دُکان نو بجے کھلتی تھی اور اسے انٹرویو کیلئے 12 بجے دن کا ٹائم دیا گیا تھا۔ اُس نے بازاروں کی دُکانوں، پارکوں کو اچھی طرح دیکھ لینے کا منصوبہ بنایا اُسے مشہور بازار، ٹی آئی کالونی، ایوب پارک، کچہری، عدالتیں، وکیلوں کے دفتر، پریشان حال مجرم اور ان کے عزیز رشتہ داروں کو دیکھنے میں لطف آنے لگا تھا۔ وہ بغیر کسی بیماری کے ڈسٹرکٹ ہسپتال بھی گھوم آیا۔

اُسے سرخ سفید عورتیں نرسیں نظر آئیں تو اسکا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے اپنے ذہن

میں اندازہ لگالیا کہ یہ شہر نسوانی حسن سے مالا مال ہے - یہاں روزگار مل جائے تو اچھا ہے اس کے دل سے کسک اُٹھی۔ بازاروں میں گھومتی پھرتی نوجوان اور پختہ عمر کی لڑکیوں اسکی ترستی آنکھوں اور تڑپتے ہوئے کو بما سکون دیا۔ فرصت کے اوقات میں کہاں کہاں بیٹھا جاسکتا ہے۔ شہر کا اچھی طرح سے تماشہ کہاں سے کیا جاسکتا ہے وہ مقامات کا یقین کرنے لگا۔ ایک ہوٹل سے اُس نے پانی اور ایک کپ چائے کا لطف اُٹھایا اور بالے کی ہوٹل والی عادت کے مطابق اخبار کی سطر سطر پڑھنے لگا۔ ایگل ٹائیرز کا دُکان چند فاصلے پہ تھی۔ ٹھیک پونے بارہ بجے وہ ایگل ٹائیرز کی دُکان میں منشی کے سامنے بیٹھا تھا۔ منشی ادھیڑ عمر کا کمزور سادہ بلا پتلا آدمی تھا۔ اُسے اس بات کا فخر تھا کہ وہ حاجی گلزار علی صاحب کے ہاں گزشتہ تیس سال سے ملازم تھا۔ اور حاجی صاحب اس پر خاص اعتماد رکھتے ہیں۔ عادل نے اپنی آوارہ اور بے غرض لیکن بیروزگار زندگی میں لاشعوری طور پر یہ ہنر سیکھ لیا تھا کہ گفتگو کے دوران دوسرے آدمی کو اپنی بے غرضی اور بے ضرر ہونے کا احساس کس رح دلایا جاتا ہے۔ پھر اسکی شکل وصورت اور جسمانیت بھی اسکے کردار کی اپنی دو خوبیوں کا آئینہ دار تھی کہ وہ بے غرض اور بے ضرر ہوکر عمر گزارنے والا نوجوان ہے۔ اس نے منشی کو اپنے مستقبل کے ارادے بتاتے ہوئے کہا، میں اپنے خرچے پر تعلیم مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ شاید دُنیا کی چند بڑی کتابیں خود خرید کر پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے روپے پیسے کی اتنی لالچ ہے نہ خواہش۔ میں نے اپنی زندگی کی بہترین خوشیاں اس وقت حاصل کیں ہیں۔ جب میری کوئی حیثیت تھی۔ اور نہ ہی جیب میں کوئی پیسہ تھا۔ شکر ہے کہ موسم بدلتے رہتے ہیں بارش ہوتی ہیں۔ درخت سوکھ کر ہرے بھرے ہوتے ہیں۔ سردی کی دھوپ اور گرمی کی چھاؤں ، بہتے دریا کے پانی میں لطف ملتا۔ اور معدے میں اُتری ہوئی ایسی بھوک جو ایک پیاز اور آدھی روٹی کو بھی دُنیا کی لذیذ ترین شے بنا کر مزہ دینے لگتی ہے۔ منشی پہلے تو اُسے غور سے دیکھتے سوچتا رہا۔ اُسے کچھ زیادہ سمجھ نہ آئی۔ لیکن اُس کا اندازہ تھا کہ وہ باتیں پہلی دفعہ سُن رہا۔ ان کا کوئی خاص اور بڑا مطلب ہوگا۔ چنانچہ اسکے دل میں سوکھے اور سانولے چہرے والے کمزور سے لڑکے کے بارے میں عزت اور ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ اس کا اظہار اس نے رازداری سے بات کرتے ہوئے کہا۔ تم سے پہلے دس پندرہ لوگ انٹرویو دے کر جا چکے ہیں۔ لیکن میرے اندازے اور حاجی گلزار صاحب کے مزاج کے مطابق کوئی بھی درست آدمی نہیں تھا۔ سب کو کم وقت میں اور کم محنت کے صلے میں زیادہ تنخواہ حاصل کرنے کی لالچ تھی۔ کئی

ایک تو چور، بدنیت پیڑ اور خوشامدی تھے اس لیے ان میں سے ابھی تک کوئی آدمی منتخب کیا گیا ویسے حاجی صاحب کو تین آدمی چاہئیں۔ میرے خیال میں تم فٹ ہوجاؤ گے۔ کیونکہ تمہارے اندر لالچ اور بھوک کا طوفان نہیں آتا۔

دوسروں کی مہربانی اور سخاوت سے زیادہ میں نے اپنی محنت پہ بھروسہ کرنا سیکھا ہے۔ عادل نے سچ بولتے ہوئے کہا۔ میں گھر میں بلکہ ایک کرایے کے مکان میں اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ تقریباً پندرہ سال سے رہائش میں آکر دیکھ رہا ہوں کہ اپنے حالات کو دوسروں کو نیکی اور اخلاص کے تحت بدلنا ناممکن ہے۔ کتنے برسوں سے ہم کو کم سے کم اور غریب سے غریب ہونے کا احساس ہوتا جارہا ہے۔ منشی اس کی بات پوری طرح سنے اور سمجھے بغیر بڑے کھاتوں کے صفحے کھول کر دیکھتا رہا۔ اور منہ سے ہوں ہاں ہاں کرتا رہا۔

حاجی گلزار نے دفتر میں اُسے بلوایا۔ اور کچھ دیر اُسے غور سے دیکھنے کے بعد بولے، تم ایف ایس سی میں کیوں فیل ہوئے ---؟ وقت اور توجہ دینے سے محروم رہا۔ اب میرا ارادہ ہے۔ پرائیویٹ پڑھ لوں--- کیا پڑھو گے۔ حاجی گلزار صاحب نے کالج کے پرنسپل کا لہجہ اپناتے ہوئے کہا۔ ایسے مضمون جو میری مالی حیثیت، وقت، سرمایے اور زندگی کے دوسرے معاملات کے باوجود میرے لیے سمجھنا آسان ہوں۔ میں ڈاکٹر، انجینئر، جج، پائلٹ، جنرل بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتا--- حاجی صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے گویا اُسکی دانشمندی کی داد دے کر اسکا حوصلہ بڑھایا۔ اور پھر پوچھا، کیا تم جانتے ہو۔ کہ تمہیں یہاں کام کرنا ہوگا۔ حاجی صاحب وہ سنجیدہ ہوکر کسی بڑے آدمی کی طرح بولا۔ میں نے تو آپ کی مرضی کے مطابق آپکے فائدے کے لیے کام کرنا ہے۔ مجھے تو آپ نے اپنی خدمت اور سہولت کے لیے استعمال کرنا ہے میں تو اپنے آپ پر اختیار دینے پر راضی ہوسکتا کوشش کروں گا کہ آپ جلد از جلد مجھ پر بھروسہ کرپائیں۔ کیونکہ میں زندگی میں سہمے ہوئے اور ڈرے ہوئے خاندان کا فرد ہوں۔ محروم ہونے کے بعد میرے پاس کوئی انتخاب اور راستہ نہیں۔ میں نے تربیت اور محرومی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ تم اپنی عمر اور تجربے سے زیادہ بڑی باتیں کرتے ہو۔ حاجی صاحب کا چہرہ اب سنجیدہ ہونے لگا تھا۔ یہ سب کس طرح ہوگیا۔

حاجی صاحب، میرے خیال میں اپنی محرومی، کمزوری اور غریبی کی وجہ سے آگہی نے مجھے کچھ ایسی چیزیں بھی فراہم کردی ہیں جن کا مجھے خود بھی پتہ نہیں چلتا۔ ہم آپ کو سات ہزار روپے ماہانہ اور ایک وقت کا کھانا۔ یعنی دوپہر کا کھانا لنچ دے سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر حاجی صاحب خاموش ہوکر اس کا منہ دیکھنے

گئے۔ پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس بلڈنگ میں اپنے رہنے کی کوئی جگہ منتخب کرلو۔ ظاہر تمہاری رہائش کا مسئلہ بھی تو ہے وہ بھی ہم تمہیں مفت فراہم کریں گے۔ کیا خیال ہے۔

مجھے منظور ہے حاجی صاحب وہ جیسے بہت بڑی نعمت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا۔ میں ابھی سے آپ کے حوالے ہوں --- حاجی صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ واہ بھئی ۔ شاباش۔

جمعہ کے دن تمہاری چھٹی ہوگی۔ یعنی پرسوں تم گھر جانا چاہو تو چلے جانا۔ ابھی یوں کرو اپنے رہنے کی جگہ ڈھونڈو۔ منشی سے کہہ دو۔ وہ تمہاری مدد کرے گا۔

منشی کے پاس پہنچ کر اس نے دیکھا کہ ایک اور جوان آدمی بیٹھا۔ اسکی موٹی موٹی سفید اور گول آنکھیں اُسے گھورنے لگیں۔ منشی نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ یہ مشتاق ہے ۔ تین دن پہلے آیا ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح ہی کام کرے گا۔ اس نے مشتاق کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مشتاق کے اندر سے اُٹھنے والا حسد اور کینے کا اظہار چھپ نہ سکا۔ میں تو عارضی طور یہاں کام کرنے آیا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد ہی دوبئی جانے والا ہوں۔ میں نے بی ایس سی فزکس میں کر رکھا ہے ۔ مشتاق نے اپنی برتری ظاہر کرنے میں کوئی دیر نہ کی۔ میں تو آج سے مزدور ہونے کا دعویدار ہوں۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور پھر منشی کو حاجی صاحب کو حکم مناتے ہوئے بولا میری مدد کریں میں نے کس کمرے میں جا کر اپنی کمر لگانی ہوگی ۔ منشی اُسے تیسری منزل پہ لے جا کر کمرہ دکھانے لگا۔ اس نے ایک کونے میں شمالی طرف کا کمرہ پسند کرلیا۔ جو شاید کسی کے لیے بھی قابل قبول نہ تھا۔ منشی نے اُسے ہمدردی اور بے چارگی سے دیکھتے ہوئے بولا۔ تم نے سب سے چھوٹا اور معمولی کمرہ پسند کیا۔ کیوں؟ کوئی اچھا سا کمرہ دیکھ لو۔ کتنے کمرے خالی پڑے ہیں۔

بس میں نے اپنی حیثیت اور ضرورت کے مطابق کمرہ منتخب کیا ہے۔ میں آج ہی اسے صاف ستھرا کر کے رات سونے کے قابل بنانے کی کوشش کروں گا، اس نے کمرے کو آسانی سے دھولیا۔ دیواریں صاف کیں، بلب لگوایا۔ موسم کے مطابق کمرہ آرام دہ تھا۔ اکتوبر کے دن تھے۔ دن رات کی گرمی قدرے کم ہو چکی تھی ۔ پرانے گتے کے بڑے بڑے ٹکڑے بچھا کر اس نے بستر بنایا۔ اس نے ایک معمولی اور رد کیے ہوئے کمرے کو اپنے لیے منتخب کر کے خود کو بے دخل ہونے سے بچایا۔ اپنی اس حکمت عملی پر وہ خود بھی مسکرا اُٹھا۔ کمرے صاف کرنے بعد نیچے آیا تو منشی اور مشتاق دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ منشی نے اس کے حصے کا سالن اور روٹیاں علیحدہ کر کے رکھ دی تھیں۔ وہ بڑے صبر اور سکون سے ہاتھ منہ دھو کر کھانا

کھانے کی دری پہ بیٹھا تو اپنی بھڑکی ہوئی بھوک کو جیسے اپنے ہی اندر کہیں گم کر بیٹھا تھا۔ اس نے مشتاق کو نوالہ بنا کر نوالے میں سالن بھرتے دیکھا تو اپنے اندر اٹھنے والی حیرت پر قابو پانے لگا۔ مشتاق کا نوالہ اُس کے چار نوالوں کے برابر تھا۔ پوری چار انگلیاں لت پت کر کے اس نے اپنی روٹیاں اور سالن ختم کر ڈالا لیکن وہ بھوک اور رقابت سے عادل کے پلیٹ کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ عادل نے اپنی پلیٹ سے آدھا سالن اسکی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے روٹی اسکی طرف بڑھادی۔ منشی نے بہت پہلے سے دیکھ لیا تھا کہ کسی طرح مشتاق نے اچھی بھری ہوئی پلیٹ اور اچھی پکی ہوئی روٹیاں اپنے لیے چن کر باقی عادل کے لیے رکھ دیا تھا۔ وہ سلاد ٹماٹر اور کھیرے بھی ہڑپ کر چکا تھا۔ عادل نے اپنے اندر جھانکتے ہوئے خوشی سے سرگوشی کی میرے اندر کی بھوک ایسی تھی جس نے مجھے پیاز اور روٹی کی لذت سے بھی سرشار رکھا ہے، بھوک اور لالچ کا فرق جاننے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ اف وہ لالچ جو آدمی کے اندر بے زاری اور حسد کے نتیجہ میں پیدا ہو۔ وہ تو شاید دوزخ کے کسی ایک درجے کی چیز ہوگی۔ اس نے دسترخوان پہ بیٹھے بیٹھے مشتاق کو یہ احساس دینے کی کوشش کی تھی کہ اُسے اپنا زیادہ حصہ لینے میں کسی تکلیف یا دشمنی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ منشی نے کھانے کے بعد اُنہیں چائے پلائی۔ اور پھر عادل سے کہا تمہارا کام کل سے شروع ہوگا۔ آج تم مہمان ہو جاؤ آرام کرو۔ عادل کو جاتے دیکھ کر بھی مشتاق نے کینہ پرور نظریں اُسکی پشت پر گاڑھتے ہوئے کہا۔ یہ دوسرے شہر سے آنے والا میرے روزگار میں کیوں شریک ہوگیا ہے۔ کوئی بات نہیں اُسے یہاں ٹکنے نہیں دوں گا۔ منشی اپنی عمر کے بڑھتے ہوئے مسائل کی وجہ سے بے نیازی کے مقام تک پہنچ چکا تھا۔ وہ مشتاق کی دھمکی سن نہ پایا۔

تین چار ماہ کے عرصہ میں عادل نے مشتاق کو اس مقام تک رکھا جہاں سے وہ اپنی فطری برائیوں کو آزمانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ حاجی گلزار اور منشی دونوں نے مشتاق کو عادل سے اُلجھنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ اسکی ذہنی پختگی اور خدمات کی وجہ سے دونوں نے اس پر زیادہ بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سیلز مین کے ساتھ ساتھ منشی کا اسٹیٹ اور حاجی صاحب کا سیکرٹری کی ذمہ داریاں بھی سنبھال لیں تھیں۔ ایک صبح منشی کے قریب بیٹھے ہوئے مشتاق نے بڑی رعونت سے نوکری سے فارغ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے کہا، میں یہ ٹائروں اور گاڑیوں کے پرزوں والے کاروبار میں پھنس کر اپنے آپ کو خواہ مخواہ تکلیف دیتا رہا ہاتھ اور کپڑے بھی گندے ہو جاتے۔ لوگ تعلیم یافتہ آدمی سے بات کرنے کا ڈھنگ

بھی نہیں جانتے سو میں نے میاں جی فارمیسی میں سیلز مین کا کام حاصل کر لیا ہے۔ صاف ستھرا کام، تنخواہ بھی زیادہ ہے۔ دوائیں بیچنی ہوں گی اور ہفتے میں ایک دن آؤٹ بھی کرنا ہوگا۔ بس کل سے فارغ سمجھیں۔ اور میرا حساب بھی چکتا کر دیں۔ کل میں شام کو حاضری دوں گا۔ منشی کو ایسے موقع پر ایک ہی بات کرنے کی عادت تھی۔ ٹھیک ہے آج حاجی صاحب کو بتا دوں گا۔ کل اپنا حساب لے جانا--- جاتے ہوئے مشتاق نے عادل سے الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے اُس پر یہ جتانے کی کوشش کی کہ وہ بہت اونچے درجے کا آدمی ہے۔ اور یہاں تاجروں کی دُکان میں کام کرنا اسکے رتبے اور اہلیت کے خلاف تھا۔ جہاں پہ عادل کی طرح چھوٹی ذہنیت کے وہ لوگ کام کر سکتے ہیں جو نچلی سطح کے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ عادل نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا تم خوش نصیب اور ذہین آدمی۔ لگتا ہے تمہاری زندگی میں اعلیٰ مقام لکھا ہوا ہے۔ (یقیناً میرے لیے دُنیا میں بڑے بڑے کام موجود ہے-- مشتاق نے آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے ہمیشہ تاجروں کی دُکان کو خدا حافظ کہہ دیا---

ماحول اور اپنی طبیعت کو پرسکون دیکھ کر عادل نے اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرکے ایک نئی طاقت اور اعتماد حاصل کرنا چاہا۔ اس نے داخلہ بھجوا کر پرائیویٹ امتحان کے لیے پڑھنا شروع کر دیا۔ نومبر دسمبر کی ٹھنڈی اور طویل راتوں میں پڑھنے کا شوق اس کے بہت کام آیا ایک دن جب کتابیں خریدنے کے لیے شہر کی بڑی دُکان میں داخل ہو گیا۔ تو اُسے مشتاق نظر آیا۔ وہ دُکان کے سامنے ایک خوبصورت کار کے پاس کھڑا تھا۔ اور دُکان کے اندر گھورے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک موٹا تازہ سفید نوجوان بھی کھڑا تھا جسکے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مشتاق اپنی ٹیپو سلطانی مونچھیں بھی مروڑتے اور لطف بھی لے رہا تھا دُکان کے اندر داخل ہوتے ہوئے عادل نے دوستانہ انداز میں مشتاق کی طرف ہاتھ ملایا تو مشتاق نے شاہانہ انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے اُسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا خلاف توقع مشتاق نے عادل کو بڑے تپاک سے گلے لگایا۔ اور اپنے بچپن کے دوست سلیم سے بھی اس کا تعارف کروایا۔ دُکان حاجی صاحب اور منشی کے متعلق چند سوالات پوچھنے کے بعد مشتاق اپنے فطری لہجہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ تم لگے رہو وہاں کام پر۔ اور کیا کر سکتے ہو۔ گزارہ کرو۔ حالات بڑے مشکل ہوتے جا رہے ہیں - کھڑے کھڑے موقع پا کر مشتاق نے عادل کو بتایا۔ یار دُکان میں میری دو کزن کتابیں خرید رہی ہیں۔ بس ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر مشتاق نے اعتماد اور رازداری سے سلیم کی طرف دیکھا۔ عادل نے گردن موڑ کر دُکان

کے اندر دیکھا تو اسے نیلے اور سیاہ کپڑوں میں دو نوجوان لڑکیاں نظر آئیں ان کے سراپا دلکش اور چہرے کی رنگت ایسی تھی کہ عادل کا دل چاہا کہ وہ انہیں دیکھتا ہی رہے وہ یقیناً میڈیکل کالج یا کسی یونیورسٹی کے طالبات تھیں۔ان کے موجودگی اور قد وقامت نے دُکان کا ماحول جگمگا رکھا تھا۔ اچھا تو اسی لیے تم مجھ جیسے پسماندہ اور معمولی آدمی کو کسی قابل نہیں سمجھتے تھے، مشتاق فتح مندی سے مسکراتے ہوئے بولا، نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ چلو آؤ، تمہیں چائے پلاؤں۔۔ نہیں تم اپنی کزنز کے ساتھ جاؤ گے۔ پھر کبھی سہی عادل نے نہایت عاجزی سے نہیں یار تم تکلف نہ کرو۔وہ چلی جائیں گی۔ اس نے عادل کو بازو سے پکڑا۔ اور کھینچا چند قدم آگے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ ہوٹل میں چائے اور سموسوں کا آرڈر دینے کے بعد اس نے جیسے بہت بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تم دونوں بیٹھو میں ابھی دس منٹ میں واپس آیا۔ چائے کی میز پر سلیم اور عادل رسمی جملوں کی مدد سے ایک دوسرے کو بہلانے میں لگ گئے، عادل نے محسوس کیا کہ سلیم زیادہ بے تکلف ہونے کے بجائے خود کو محفوظ اور پابند کیے ہوئے۔ لیکن عادل نے اپنی فطری بے تکلفی کے باعث اُسے اپنا دوست بنانے میں ہر طرح کی بیگانگی کو مٹا ڈالا۔ مشتاق آدھے گھنٹے بعد آیا۔ اور آتے ہی فاتحانہ مسکراہٹ سے سلیم کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ شاید قسمت کی دیوی کو مائل کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔

اچھا تو تمہارے اندر یہ جو تمکنت اور غرور ہے اسکی وجہ آج میری سمجھ میں آئی ہے؟ عادل نے مشتاق کی گول اور موٹی موٹی آنکھیں ٹیڑھی گھماتے ہوئے کہا۔ مطلب یہ کہ تم اور تمہارے خاندان کے لوگ نہ صرف یہ کہ مالی طور پر خوشحال ہیں بلکہ خوبصورت بھی ہیں۔ تم خفا تو نہیں ہوگے۔ اگر میں کھل کے بات کروں۔ عادل نے ذرا توقف کے بعد کہا، مشتاق نے اپنی ادا میں بے تکلفی کا رنگ شامل کرتے ہوئے کہا نہیں یار۔ جو دل میں ہو کہہ دو۔ عادل نے مشتاق کو کھلتے ہوئے دیکھا تو بے باکی سے بولا۔ اصل میں تمہارے خاندان میں خوبصورت لوگ بہت ہیں۔ یعنی تم خود بھی ماشاء اللہ جاذب نظر آدمی ہو۔ اور تمہاری کزنوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تمہاری خواتین بھی بہت پروقار اور پرکشش ہیں۔ تم آج مجھے اپنے سے کئی گنا خوش قسمت اور بلند نظر آئے ہو۔

اچھا۔۔! مشتاق نے لمبی تان لگا کر قہقہہ لگایا۔

تم سے کیا پردہ اور کیا شرم مشتاق بھائی۔ عادل نے جیسے شرمسار ہو کر منہ بناتے ہوئے کہا۔ ہمارے خاندان میں خوبصورت لوگوں کی کمی ہے۔ تم مجھے دیکھ لو۔ ہماری عورتیں بھی۔ تقریباً تمام ہی بدصورت

ہیں- کیا بک رہے ہو، مشتاق نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا- سلیم نے حیرانی بلکہ قدرے ندامت سے عادل کو دیکھتے ہوئے منہ سے افسوس بھری سرگوشی نکالی- یار میں سچ کہہ رہا ہوں- مجھے خواہ مخواہ بلند تر ہونے کا کوئی شوق نہیں- عادل نے انہیں اعتماد سے اپنی بات پر توجہ دلاتے ہوئے کہا، ہماری زندگی کے بہت سے مسائل، یعنی غربت، بدقسمتی، پسماندگی وغیرہ سب ہمارے ہاں کی بدصورت عورتوں کی وجہ سے ہیں اگر میری ماں کی شکل وصورت والی کوئی عورت مجھے باہر نظر آجائے تو شاید میں ترس کھا کر اپنی بلائیں ٹالنے کے لیے اُسے خیرات میں چند روپے دے کر شکر بجالاؤں- میری دو بڑی بہنیں سری لنکا کے کسی قدیم قبیلے کی پیداوار لگتی ہیں- ان کے چہرے کے نقش اور رنگت میں ایسا بھیانک پن ہے کہ ان کے قریب بیٹھ کر آدمی کو اپنے مقدر پر غصہ آنے لگتا ہے، دُنیا کی ہر شے سے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے، میری ماں اور دو بہنوں کو نہ گھر سنوارنا آتا ہے نہ کوئی اچھی بات کرنی آتی ہے- ہمارے گھر میں نہ کوئی برتن اور نہ ہی کوئی کپڑا ایسا ہے جسکا رنگ اور معیار آنکھوں کو بھلا لگے- ہمارے گھر کی دیواروں میں اینٹوں کے درمیان بڑے سیاہ شگاف ہیں- جن میں میری ماں اور بہنوں نے کنگھی کرنے کے بعد اپنے بالوں کے گچھے ٹھونسے ہوتے ہیں- ان شگافوں میں اور درزوں میں سے کئی بار کنکھجورے اور بچھو بھی برآمد ہوتے رہتے ہیں- اس پر دوگنی اذیت اسوقت ہوتی ہے جب دُکھ اور خوشی کے موقعوں پر ان کے چہرے حلیے، اور حرکتوں میں نیچ پن اور بدنمائی کا رنگ زیادہ بلکہ گھناؤنا ہو جاتا ہے- کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میری ماں، بہنیں اور بھابیاں صرف یہ کہ بدشکل ہیں بلکہ بدسلیقہ، پھوہڑ اور بدتمیز و بدتہذیب بھی ہیں-

عادل کے لہجے کی روانی اور پختگی کا اتنا اثر ہوا کہ مشتاق اور سلیم کے منہ سے حیرت کی وجہ سے قہقہہ بھری آہیں برآمد ہونا شروع ہو گئیں-

یار تم کمال باتیں کر رہے ہو، مشتاق اپنے قہقہے روکتے ہوئے بولا، میں نے اس قسم کی باتیں پہلے کبھی زندگی میں نہیں سنیں---

مشتاق اور سلیم کو لطف اندوز ہوتے دیکھ کر عادل کا لہجہ اور نکھرنے لگا، یہ جو کہتے ہیں نا خدا جب حسن دیتا ہے، نزاکت خود ہی آجاتی ہے، تو یہ سب تمہارے گھر اور خاندان کی مناسبت سے درست ہے- جبکہ ہمارے ہاں تو بہت کچھ اُس کے الٹ ہے- یہ جو میں اپنے شہر سے اتنی دور مزدوری کرنے آیا ہوں- تو اسکا مطلب صرف پیسہ کمانا ہی نہیں ہے تمہارے باتیں سن کر مجھے تم پر ترس آنے لگا ہے، مشتاق نے بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عادل کو سمجھاتے ہوئے کہا، اس شہر میں

شیر بن کے رہو۔ کسی قسم کی ضرورت ہو تو بلا جھجک حکم کرنا۔

بس یار میں حد سے زیادہ بدصورتی اور پسماندگی سے بھاگا ہوا آدمی ہوں، عادل نے پھر جیسے اپنی ادھوری کہانی مکمل کرنا شروع کی، میرے باپ نوکری کے بعد خدا جانے گھر کیوں آتا تھا۔ کیونکہ نہ کسی کو اسکا انتظار ہوتا تھا۔ نہ اُسے سکون ملتا تھا۔ نہ پیاس میں ٹھنڈا پانی۔ اور نہ بھوک میں اچھی روٹی۔ ہم سب کا یہی حال رہا ہے۔ میری بڑی بہن اپنے چار بدشکل بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آبسی ہے۔ روز کے جھگڑوں اور نشے کی عادت نے اُسکے شوہر کو جیل میں بھیج دیا ہے۔ میری دوسری بہن اتنی کالی اور بے جوڑ نقوش کی مالک ہے کہ اسکا شوہر روزانہ اُسے پیٹتا رہتا ہے۔ اف، میری دو بھابیاں تو شاید پچھلے جنم میں ڈراؤنی چڑیلیں ہوں گی۔ بڑی بھابی تو اکثر میرے بھائی کے کپڑے پہن لیتی ہے چلتے وقت وہ سیدھے قدم رکھنے کی بجائے دائیں بائیں جھوم کر یوں چلتی ہے۔ جیسے گندی نالیاں پھلانگ رہی ہو۔ زندگی میں مجھے آج تک اسکا کوئی رویہ اچھا نہیں لگا۔ میرے بھائی کے آگے کھانا ایسے رکھتی ہے۔ جیسے کتے کے آگے ہڈی پھینکی جاتی ہے۔ بہت لمبے ناک اور کھلے کھلے دانتوں میں ہوا نکال کر بولتی ہے۔ آنکھوں میں پیلاہٹ دیکھ کر آدمی سہم جاتا ہے۔ اس کے تین چھوٹے لڑکے اتنے کالے اور دبلے ہیں کہ انہیں کپڑوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ میری چھوٹی بھابی کی ناک اتنی چھوٹی اور بھدی ہے جیسے کٹ چکی ہے۔ مجھے ڈر لگا رہتا ہے کہ بہت بڑے سیاہ ماتھے اور موٹے موٹے ہونٹوں کے ہوتے ہوئے اسکی ناک کٹی ہوئی ہے۔ کہیں سچ مچ ناک نہ کٹوا دے، مشتاق نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ یار تم نے تو ہمیں پریشان ہی کر دیا ہے۔ ٹھہرو، ذرا دم تو لے لو۔۔۔ چائے کا ایک ایک کپ اور پیتے ہیں۔۔۔

گرم چائے کی بھاپ لیتے ہوئے عادل نے ڈرامائی مکالمہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ہمارے سارے مسائل غربت، بھوک، کم حیثیتی سب کے سب صرف ہماری خاندان کی بدصورت اور بدسلیقہ عورتوں کی وجہ سے ہیں۔ میرے بہن بھائیوں کے بچے۔۔۔ توبہ۔۔۔ توبہ۔۔۔ شاید کوئی ناجائز بچہ ہی پیدا ہو جو شکل وصورت اور عادات میں اچھا اور پسندیدہ ٹھہرے ورنہ اب تک صرف بھونڈے اور کمزور بندر کوئلے کے لیپ کے ساتھ پیدا ہوتے چلے آرہے ہیں اس نے سلیم اور مشتاق کی دلچسپی اور روحانی مسرت محسوس کر کے چائے کی چسکی لیتے ہوئے پھر کہا اس لیے کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ میں کسی دلکش اور حسین وجمیل عورت کے قدموں میں لیٹ کر صرف ایک ہی درخواست کروں کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق مجھے پیٹ ڈالے۔ مجھے اتنی اذیت

اور نفرت دے کہ میرے دل ودماغ پر طاری پرانی نحوست ڈھل جائے۔ تم دیکھ لینا۔ میں کسی دن کسی خوبصورت عورت کے ہاتھوں بڑا ذلیل ہو کر پیٹوں گا۔

ہوٹل سے باہر نکلتے وقت مشتاق نے بے تکلفی اور دوستی کی شدت کی وجہ سے عادل کے کاندھوں پر اپنا بایاں بازو پھیلا کر اُسے اپنی بغل میں بھینچ لیا۔ وہ کچھ دیر چلنے کے بعد اپنے مصنوعی سے لہجے بولا یار آج تمہیں چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ آج ہمارے ساتھ وقت گزارو۔ چلو کمپنی باغ کی طرف چلتے ہیں۔ شاید تمہیں کوئی خوبصورت عورت ہی نظر آجائے۔

تینوں دوست واپڈا کالونی کی دیوار کے پاس سے گزرے تھے کہ عادل کو ایک ریڑھی والے کے پاس ایک ادھیڑ عمر بھدی سی عورت نظر آئی۔ گہرے بھورے رنگ کی لمبی اور کھلی قمیض، نیلے رنگ کی پرانی شلوار اور ہرے رنگ کی چادر میں اس عورت کو دیکھ کر عادل مشتاق کی بغل سے نکلتے ہوئے بولا یار مشتاق یہ ہے وہ عورت جو اپنی بدصورتوں اور نحوستوں کے ساتھ ہماری روحوں کو عذاب میں رکھے ہوئے ہے۔ مجھے کوئی خوبصورت عورت تو ملے گی نہیں۔ کیوں نہ میں اس کے پیروں میں لیٹ کر، ہاتھ جوڑ کر اس بھدی اور بدنما عورت سے درخواست کروں کہ اپنی ساری نحوستوں سے آج مجھے آئندہ کے لیے نجات دیدے — یہی وہ چہرہ ہے۔ یہ وہ بدصورتی اور پسماندگی ہے جس نے ہمیں خاص کر مجھے پیس کے رکھ دیا ہے۔

عادل جیسے ہی لپک کر عورت کی طرف جانے لگا۔ سلیم نے اُس کا بازو کھینچ کر اپنے قریب کرتے ہوئے ڈانٹ کر کہا۔ بس بس۔ زیادہ جذباتی نہ ہو۔ عادل بھائی ایسے حالات نہیں بدلتے۔ ہمارے لیے بھی مصیبت پیدا کرلو گے۔ تم تو واقعی بجھے ہوئے زیادہ ستائے ہوئے آدمی لگتے ہو---

ہاں یار یہ مجھے کیا ہو گیا ہے، عادل نے شرمندگی سے کہا۔ لگتا ہے مجھے واپس چلنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ مجھ سے کوئی حماقت سرزد ہوجائے۔ اور میرے ساتھ تم دونوں بھی ذلیل ہو جاؤ۔ مشتاق اور سلیم نے تڑپ کر اس سے جان چھڑالی۔ دُکان کی دوسری منزل پر اپنے ڈربہ نما کمرے میں وہ بیٹھ کر یونہی کتابوں کے ورق کھولنے لگا۔ کسی کتاب کو پوری طرح پڑھنے کی اس میں سکت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ساری رات اپنی گفتگو کی وجہ سے مشتاق اور سلیم کی مسرتوں پر حیران ہو رہا تھا۔ صرف اپنے آپ کو حقیر اور ہیچ ثابت کرکے وہ دونوں کے قریب ہونے کا مستحق ٹھہرا تھا۔ یہ عجیب وغریب واردات اُسے کبھی فتح اور کبھی ندامت سے دوچار کیے جارہی تھی۔ رات کی ٹھنڈک بڑھی تو وہ پرانے موٹے کمبل میں حرارت کھوجتے کھوجتے سو گیا۔

صبح نو بجے اس نے دُکان کے جنگلوں والا بڑا دروازہ کھولا۔ دُکان کے اندر سارے کمرے کھولے، چیزوں کو ترتیب سے رکھنے کے بعد وہ قریب کے ہوٹل میں ناشتے کا آرڈر دینے نکلا تو سامنے سے سلیم اُسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ خوشی اور حیرت سے چیختے ہوئے سلیم کی طرف بڑھا۔ اور خلوص سے بولا۔ تم دُکان میں بیٹھو۔ میں ناشتے کا کہہ کر آتا ہوں۔ آج دونوں مل کر ناشتہ کرتے ہیں۔ سلیم کو دُکان میں بٹھا کر وہ جلدی جلدی ہوٹل کے ایک لڑکے کے ہمراہ پرتکلف ناشتہ لاتے ہوئے بولا۔ آج تمہاری وجہ سے میں بھی اچھا ناشتہ کروں گا۔ سلیم نے احسان مندی اور لطف کیساتھ ناشتہ کر کے اپنی بات سنائی، میں تمہارے پاس بہت خاص مقصد لے کر آیا ہوں۔ بلکہ خبردار کرنے آیا ہوں کہ مشتاق کے ساتھ اکیلے میں کہیں نکل نہ جانا۔ عادل مسکراتے مسکراتے اچانک سنجیدہ ہو کر سلیم کا منہ تکنے لگا۔ اس کا پورا منہ سوال سا بن گیا تھا۔ تو سلیم نے ہمدردی سے جھڑکتے ہوئے کہا۔ یہ کل جو تم ایک بدشکل سی عورت کے سامنے لیٹ کر نجات کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ تمہیں پتہ ہے وہ کون تھی۔۔۔ وہ مشتاق کی سگی ماں تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ میں نے تمہیں روک لیا۔

ورنہ کل کا دن تمہاری آئندہ زندگی کے لیے بہت بڑا سبق بن کے رہ جاتا۔ عادل نے سلیم کی بات آدھی سنی اور آدھی سُن ہی نہ پایا۔ اس کے مُنہ سے ہلکی سی ایک آہ نکلی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ بھینچ لیا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا منہ ایک تھوتھنی بن کر چوہے کی شکل میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے سچ مچ شکنجے میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح اپنی وحشت زدہ آنکھیں گھما گھما کر سلیم کی طرف یوں دیکھا جیسے زندگی اُسی کے رحم و کرم پر ہے، سلیم نے اُسکی ہوائیاں اُڑاتے دیکھیں۔ تو اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولا۔ کوشش کرنا کہ تمہارے قریب نہ آپائے۔ اور نہ ہی کبھی اُس کے ساتھ کہیں سیر وغیرہ پہ جانا۔ وہ فطری طور پر کینہ پرور، کمینہ اور خودغرض بلکہ بے رحم آدمی ہے، کیونکہ میں اُسے بچپن سے جانتا ہوں۔ اس کے مزاج اور خاندان کی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہمارا سالوں پرانا تعلق ہے۔۔

عادل کو اپنے ہوش ٹھکانے پہ لاتے ہوئے بڑی مشکل پیش آ رہی تھی۔ سلیم نے اسکی ذہنی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ کوئی بات نہیں یار۔۔۔ ذرا عقل سے معاملے پر غور کرنا شروع کرو۔ تم نے کوئی قتل تو نہیں کیا۔۔۔ پھر اسکے خوف اور ندامت سے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر محظوظ ہوتے ہوئے بولا، مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اُس دن شروع سے لے کر آخر تک تم

نے جتنی باتیں بھی کیں۔ وہ سب کی سب مشتاق کی زندگی۔ اور اس کے خاندان کی سچی تاریخ بیان پہ تھیں۔ مجھے حیران کر دیا تھا۔ تم نے جب اپنی بہنوں بھائیوں اور ماں کا ذکر کر رہے تھے۔

مشتاق کی ماں جیسی دکھائی دیتی ہے مزاج اور عادت میں اُس سے بھی زیادہ بدتمیز ہے اس نے کئی مرتبہ مشتاق کے ابا کی ٹھکائی بھی کی ہے۔۔۔۔ عادل نے لمبی لمبی سانس لے کر سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں حیرت سے کھولنا شروع کیں۔

مشتاق کا ابا کئی سالوں سے ایک پرائیویٹ سکول میں چوکیدار ہے۔ اور بہت کم گھر آتا جاتا ہے۔ مشتاق کی تین بڑی بہنیں ہیں۔ سب کی سب مردانہ بدصورتی کا شکار ہیں۔ مضبوط اور پھیلے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ اور ناک نقشہ بھی۔ رنگ بھی کالا۔ آوازیں بھی للکار جیسی ہیں۔ خدا جانے ان میں عورتوں والی کوئی بات کیوں نہیں عمر میں ڈھل چکی ہیں۔ ان کی شادیاں نہیں ہوتیں۔ مشتاق کا بڑا بھائی ڈیلا۔ چوری اور چرس فروخت کرنے کے جرم میں کئی بار جیل جا چکا ہے۔ اب بھی جیل میں ہے۔ کوئی ضمانت نہیں دے رہا۔

''یار میں حیران اور پریشان اس لیے تھا کہ تمہارے گھر اور خاندان کے معاملات اور دیگر اوصاف مشتاق کے گھر والوں سے کتنی شدید مماثلت رکھتے ہیں۔ توبہ توبہ سلیم نے اپنی پھولی ہوئی سانس سنبھالتے ہوئے کہا ویسے تمہاری زندگی کا یہ واقعہ بہت جلد ایک بڑا حادثہ بن کر رونما ہونے والا ہے۔۔

عادل نے خوف سے چونکتے ہوئے جھرجھری لیتے ہوئے کہا مجھے کیا کرنا چاہیے تم میری مدد کر دینا۔۔'' مشتاق نے مجھ پر اپنا ارادہ ظاہر کر دیا ہے۔ سلیم نے سنجیدہ ہوتے کہا اس نے غصے میں مٹھیاں بھینچے ہوئے کہا کہ وہ کسی دن تمہیں کسی ویران جگہ لے جا کر تمہارے دانت توڑ دے گا۔

عادل نے گھبراہٹ میں اپنا دایاں انگوٹھا منہ میں ڈال کر دانتوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ ابھی تک اُڑا ہوا تھا۔ اب تو سلیم اس کی حالت دیکھ کر پورا پورا لطف لینے لگا تھا۔ تم نے بُری طرح سے اسکی غیرت جھنجھوڑ کے رکھ دی،،

میرے مستقبل کے سب ارادوں پہ پانی پھیر گیا ہے۔ عادل آہ بھرتے ہوئے بولا، واپس جانا اور روزگار چھوڑ دینا۔ میرے لیے بہت مشکل ہے۔ یہاں رہنا بھی مسئلہ بن گیا ہے،، کاش مشتاق اُسی وقت میرے دانت توڑ دیتا جب میں اسکی ماں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بس تم ہوشیار رہ کر زندگی گزارو۔ سلیم نے سمجھاتے ہے کہا اِدھر اُدھر اکیلے گھومنے کی ضرورت نہیں آہستہ آہستہ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

آئندہ میں نے ایک دم کسی سے بے تکلف نہیں ہونا۔ عادل نے سلیم کے سامنے حلفیہ

بیان دیتے ہوئے بولا۔ میں نے کسی سے اس شہر میں تعلق اور دوستی قائم نہیں کرنی۔ میں غریب اور پسماندہ خاندان کا فرد ہوں۔ مجھے روزگار اور اچھے ماحول کی ضرورت ہے میں کوشش کروں گا کہ محتاط۔ اور مختصر باتیں کرنے کی عادت اپنالوں۔۔۔ اپنے آپ تک محدود رہو گے تو محفوظ بھی رہو گے سلیم نے دانشمندی کا اظہار کرتے ہوئے ویسے قصہ یہ ہے کہ مشتاق کے ابا۔ پنجاب کے کسی شہر سے اسکی اماں کو بھگا کر لایا تھا لیکن میری دادی کہتی ہیں کہ مشتاق کی اماں اس کے باپ کو بھگا کر یہاں واپس لائی تھی۔ پھر کچھ عرصہ بعد مشتاق کی اماں نے اپنے دو جوان میلے کچیلے اور بھونڈے کالے بھائی بھی اپنے ہاں بلوالیے۔ ان کے بچے بھی جوان ہو چکے ہیں۔ کالا رنگ اور بدتمیزی و پسماندگی اس خاندان کی اصل میراث لگتی ہے سب کے سب ایک جیسے ہیں دونوں ماموں ویگن چلاتے ہیں۔ میری دادی تو یہ بھی کہتی ہیں۔ کہ مشتاق کے ابا اور امی کا نکاح بھی نہیں ہوا۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ اپنے سارے خاندان میں مشتاق سب سے الگ تھلگ اور صاف ستھرے چہرے کا مالک ہے۔ مشتاق کے ابا کی پندرہ بیس سال پہلے تندور والے ایوب چچا کے ساتھ بڑی زبردست لڑائی ہوئی تھی کئی سال مقدمہ چلتا رہا۔ مشتاق بالکل ایوب چچا سے ملتا جلتا ہے اور وہ کتابوں کی دکان میں جو لڑکیاں تھیں۔ ان سے مشتاق کا کوئی تعلق نہیں۔ ویسے ہی اس دن مشتاق نے بے تکلفی سے راہ چلتے انہیں سلام کر دیا تھا۔ جس پر وہ ہنس پڑیں تھیں۔ بس پھر سارا دن مشتاق مجھے ان کے تعاقب میں لیے لیے پھرتا رہا۔ مجھ سے کہتا تھا کہ تم کسی ایک کو اپنی طرف مائل کرلو۔ دوسری کو میں بدنام کر کے پھنسالوں گا۔

تم مجھے پریشان بھی کر رہے ہو۔ ڈرا بھی رہے ہو اور میری دلچسپی میں اضافہ بھی کر رہے ہو۔ عادل نے ہار مانتے ہوئے کہا میں تو آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر بے بس ہو رہا ہوں۔

دکان میں منشی کی آمد سے ماحول بدلا تو سلیم نے اُٹھتے ہوئے عادل کو حوصلہ اور اعتماد دیتے ہوئے کہا۔ فکر مت کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میرے بغیر مشتاق کوئی خطرہ مول نہیں لیتا۔ تم پر کوئی برا وقت نہیں آئے گا۔

سلیم کے چلے جانے کے بعد عادل تو جیسے بخار میں تپتا رہا۔ منشی نے اسی توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ کیا بات ہے عادل میاں۔ یہ بار بار تمہارا انگوٹھا منہ میں چلا جاتا ہے۔ دانت وغیرہ میں درد تو نہیں ہے تمہارا چہرہ کافی بجھا ہوا ہے۔ طبیعت کچھ خراب ہے اس نے منشی کو مطمئن کرتے ہوئے کہا اس علاقے میں سردی کافی زیادہ ہے۔ آج لنڈے سے کوئی موٹا کمبل خریدوں گا۔ اس دن عادل سے کئی کام غلط ہوئے۔ کئی بار وہ

لڑکھڑایا۔ شام کو بہت پہلے ہی ٹھنڈے فرش پہ بچھے ہوئے پرانے بستر میں گھستے ہی اس نے خود کو کئی بار ایسے بلایا۔ جیسے کسی پہ جتلا رہا ہو کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ اگلی صبح سے کئی دن تک وہ اسی کیفیات میں ڈرے ڈرے محتاط رہنے کا عادی ہو گیا۔ جیسے اُس نے کوئی چوری کرلی ہو۔ اور اس کے پکڑے جانے کے تمام امکانات موجود ہیں۔ ہر گزرتے دن کے بعد وہ اپنی خوش قسمتی کو محسوس کر کے خدا کا شکر بجالاتا۔ اور یوں ڈیڑھ ماہ گزر گیا۔ دسمبر کی ٹھنڈی اور خاموش شام کو بارش کی بوندوں نے ایک پراسرار سے حسن دے رکھا تھا اندھیرا گہرا ہو رہا تھا۔ اسے جمعرات کو گھر جانا تھا۔ منشی وقت سے پہلے گھر جا چکا تھا۔ عادل نے دُکان کے اندرونی اور بیرونی دروازے بند کر کے الماریوں کے سامان کو ترتیب دے کر دُکان بند کر دی تھی۔ شام اور بارش کا منظر اسکے دل کو چھوئے جا رہا تھا۔ ہلکے ہلکے جھونکے اسکے جسم میں کپکپی بھر کے گزر جاتے وہ اسی سوچ میں تھا کہ کیا کرے۔ کہ اچانک اس کی دُکان کے بالکل سامنے ایک موٹر سائیکل آ کے رُکا۔ اُترنے والا جوان آدمی مشتاق تھا۔ جسے دیکھتے ہی اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے وہ اسکے استقبال کے لیے اُٹھا۔ گلے ملتے ہوئے اس نے موسم سردی کے بہانے اپنے خوف اور کپکپی کو چھپانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ بازار مچھلی لینے آیا تھا سوچا تم سے ملتا جاؤں،،

مشتاق نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے کہا اچھا کیا۔ میں بہت بور ہو رہا تھا اور سردی بھی لگ رہی تھی اس لیے کچھ سوچنے اور کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ سلیم کیوں نہیں آیا تمہارے ساتھ؟ عادل نے معمولی گفتگو کرنے کا حوصلہ ڈھونڈنا شروع کیا۔ سلیم تو دوبئی چلا گیا ہے اُسے ایک کمپنی میں ڈرائیور کی نوکری مل گئی ہے مشتاق نے خوشی سے موٹر سائیکل کی چابی لہراتے ہوئے کہا۔ میری اُس سے بات ہوتی رہتی ہے۔ خوش ہے بھئی ایک لاکھ روپے پاکستانی ہر ماہ کی تنخواہ ہے۔ وہ جم گیا تو میں بھی دوبئی چلا جاؤں گا۔ اور ہاں تم نے سلیم کے ساتھ بہت بُرا کیا ہے، عادل جو سلیم کے دُبئی جانے پر خوشی کا اظہار کرنے والا تھا۔ سہم کر بزدلی سے اسکا منہ دیکھتے ہوئے بولا میں کسی سے کیا برائی کر سکتا ہوں۔ پھر بھی کیا ہو گیا ہے۔
تمہیں یاد ہے نا تقریباً 2 ماہ پہلے کا واقعہ۔ مشتاق نے کرسی سے کمر کی ٹیک سیدھی کرتے ہوئے کہا۔ تم نے واپڈا کالونی کے قریب۔ اسکے سامنے اسکی ماں کے بارے میں غلط باتیں کیں تھیں۔ یاد آیا۔ مشتاق نے ٹیپو سلطانی مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا۔
عادل بلبلاتے ہوئے چیخ پڑا۔ اوہ۔۔۔ یہ کیا؟ اس نے میرے دانت کیوں نہیں توڑ دیئے۔۔۔ میں تو انجان تھا، بے خبر تھا، بڑا ظلم کر دیا میں نے۔۔۔۔
تمہارے دانت وہ ضرور توڑتا۔ اگر میں

اُسے قابو کر کے - ٹھنڈا نہ کرتا شکر کرو--
مشتاق نے سخاوت اور اخلاص سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا اب کیا ہوگا؟ عادل شکستگی سے بولا اگر وہ آجاتا- مجھے مار پیٹ لیتا- اور میں اُس سے معافی مانگ لیتا- تو میرا دل پرسکون رہتا-
چلو کوئی بات نہیں- اب تو وہ ایک دو سال بعد ہی لوٹے گا- تم فکر نہ کرو- دُبئی کے ماحول میں اُسے کہاں کچھ یاد رہے گا-
تم لوگوں نے اندازہ تو لگا لیا ہوگا کہ میں کتنا نیچ- اور احمق آدمی ہوں- میں ہر طرح کی سزا کے لیے تیار ہوں- عادل نے مجرموں کی طرح اعتراف کرتے ہوئے کہا اب کیا کر رہے ہو- چلو نا میرے ساتھ میں تمہیں لینے آیا ہوں-
چاچا شیرے کی مچھلی بہت مشہور ہے، مشتاق نے اُسے یوں دعوت دی جیسے شیرے کے ساتھ اسکا قریبی تعلق ہے اور وہ اسی کا منتظر ہو- ''چلو چلتے ہیں''- عادل نے چُستی اور دلیری سے کہا- دعوت میری طرف سے ہے، وہ بڑے اعتماد سے مشتاق کے پیچھے موٹر سائیکل پہ بیٹھ گیا- اُسے آج اپنے اندر ایک عجیب طرح کی جرأت اور طاقت کا احساس ہو رہا تھا- اپنی جسمانی طاقت اور رعب دار مونچھوں کے باوجود مشتاق اُسے ایک کمزور اور کم عمر سا لڑکا نظر آنے لگا- جسے وہ آسانی سے قابو کر کے اُسکی خوب دھلائی بھی کر سکتا تھا- اُس نے ہر طرح کے حالات سے نمٹنے کیلئے خود کو تیار کر لیا تھا-
مشتاق بارش اور ٹھنڈ کے باوجود مہارت سے موٹر سائیکل چلاتا ہوا شیرے کی دُکان پہ جا کے رُکا- ہوٹل کے بڑے ہال میں ایک کونے میں رکھی میز اور کرسیاں منتخب کر کے وہ دونوں بیٹھ گئے مشتاق اپنے کوٹ اور بالوں پہ پڑی ہوئی بوندیں جھاڑنے میں مصروف تھا- عادل نے اُسے دیکھتے ہوئے سوچا اپنی تربیت اور دانش کے لیے- یہ آدمی برا نہیں- اسکے کمینے پن سے محفوظ رہ کر اسکو دوست بنائے رکھنا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہوگا- سلیم واقعی بڑا آدمی تھا- لیکن مشتاق کے ساتھ وقت گزارنا- شاید یونیورسٹی کی کلاس میں بیٹھنے سے زیادہ پر لطف اور سود مند ہوگا- عادل کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر مشتاق نے پوچھا- کیا دیکھ رہے ہو---؟
کچھ نہیں عادل نے فراخدلی سے کہا تمہیں پتہ ہے نا-- میں تمہارا میزبان ہوں یہ کہہ کر اس نے ڈیڑھ کلو مچھلی کا آرڈر دیدیا- اس کے ساتھ ہی عادل نے میز پر طبلہ بجاتے ہوئے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جب تک وہ اس شہر میں رہے گا- اُسے مشتاق کی میزبانی کرنا پڑے گی- اس کے اندر کی روحانی خوشی ایسی تھی کہ اُسے اپنا یہ فیصلہ زیادہ مشکل اور مہنگا بھی محسوس نہ ہوا-

☆☆☆☆☆

وینٹی لیٹر

آج کی اطلاعات کے مطابق ملک بھر میں ایس او پیز کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں لوگ عید کی خریداری میں مشغول ہیں کندھے سے کندھا ملائے مرد و زن مارکیٹس میں اپنی اپنی پسند کی اشیا خریدنے کے لیے پُر جوش دکھائی دے رہے۔ کرونا نے گھمبیر صورت حال اختیار کر لی ہے-- اگلے چوبیس گھنٹوں کے دوران یہی صورتحال رہی تو مکمل لاک ڈاؤن متوقع۔ یہ میڈیا والے بھی کیا عجیب وغریب خبریں نشر کر رہے انسان کو دماغی مریض بنا دیا-- مجال ہے جو کوئی کام کی خبر ہو جو چینل بدلو کوئیڈ کی وجہ سے چالیس جاں بحق 220 لوگوں کا ٹیسٹ مثبت آنے پر ہسپتال منتقل کر دیا گیا-- افففففف -------یا معبود!... زچ ہو کر اس نے ریموٹ صوفے پر پھینکتے ہوئے علیزے کو آواز لگائی---علیزے علیزے---- جلدی کرو ابھی تک ناشتہ نہیں بنا مجھے دیر ہو رہی بس تیار ہے --- اسد آپ آجائیں ٹیبل پر-- کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے علیزے کو مخاطب کیا آج شام چار بجے تیار رہنا میں دفتر سے جلدی آجاؤں گا پھر شاپنگ پر چلیں گے-- لیکن اسد--اپ نے ابھی خبریں نہیں سنی باہر کی حالات تشویش ناک ہیں--ان کو چھوڑو نیوز چینل والوں کو تو بس کوئی بھی موضوع دے دو انکا تو کام ہے بات کا بتنگڑ بنانا- اسی سے تو ان کا چولہا جلتا-- لیکن ---- لیکن ویکن کچھ نہیں تم بس تیار رہنا--- اوکے میں جا رہا اللہ حافظ اچھا ناشتہ تو صحیح سے کریں میں نے کر لیا دیر ہو رہی اللہ حافظ --- وہ بیگ اٹھاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا-- کرونا کرونا کرونا!---یہ کونسا وائرس ہے؟ کونسی بیماری ہے--بیماری ویماری کوئی نہیں بس عوام میں خوف وہراس پیدا کر رہے--

تہنیت رباب

آج پھر آفس میں باسط اور اسد کے زیر بحث یہی موضوع تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ دونوں اس موضوع پر الجھتے آرہے تھے-- ایک طرف اسد جو کرونا کے وجود سے انکار کر رہا تھا اور دوسری طرف باسط جو اس کو زچ کرنے کے لیے ہمہ وقت یہ موضوع چھیڑ لیتا --وقتاً فوقتاً ان دونوں میں کرونا کو لے کر جنگ جاری رہتی باسط سمجھاتا رہتا کبھی دلائل سے کچھ مذاق سے ---یار اسد اس حقیقت کو تسلیم کرو کرونا اگزسسٹ کرتا ہے یہ جان لیوا بیماری پرہیز ہی اسکا علاج ہے لیکن وہ اسد ہی کیا جو مان جائے۔ آج باسط نے اسے پھر لیکچر دیا یار سمجھنے کی کوشش کرو یہ جو تم نے ٹوپی ڈرامہ ٹوپی ڈرامہ کی رٹ لگا رکھی ہے ایسا کچھ نہیں ہے -- خدانخواستہ تم یا میں اس حالت سے گزریں تو احساس ہوگا کہ ہے یا نہیں جو اس اذیت سے دوچار ہیں وہی اس درد کو محسوس کرسکتے۔ اسد یار باسط اس موضوع کو یہیں ہی ختم کرواو کے یار ویسے بھی صبح صبح میں بھی اس بے میں نہیں پڑنا چاہتا-- جاتے جاتے اسے پھر شرارت سوجھی--

اسد جواب اپنے مانیٹر کی سکرین پر نظریں جمائے کام میں مصروف تھا باسط کے مخاطب کرنے پر نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ ٹیبل پہ رکھے ماسک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے اچھا یار بات سنو ایس او پیز کو فالو کرو آج وہ بھرپور موڈ میں تھا کہ اسد کو تنگ کرے-- اس پر اسد ایک بار پھر بھڑک اٹھا کونسی ایس او پیز۔ کیسا ماسک--؟ اب یہاں کہاں کرونا آگیا-- جا بڑا آیا مجھے ایس او پیز بتانے والا ------ اسد ماسک اٹھاتے ہوئے نجانے کیا بڑبڑا رہا تھا جس پر اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور واپس اپنے کیبن میں چلا گیا-- بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے وہ دونوں بہت خوشگوار موڈ میں تھے ایک دکان پر لوگوں کا ہجوم تھا-- دکان کے باہر بڑے بڑے بینرز آویزاں تھے ------------- سیل سیل سیل--- بائے ون گیٹ ون فری--- وہ بھی اس دن میں آگئے۔ جیسے جوتے خریدنے کے لیے دکان میں داخل ہوئے تو گارڈ نے سینیٹائزر آگے بڑھاتے ہوئے کہا سر ماسک پلیز--- اف یار! کیا مصیبت ہے اب بندہ

کھلی ہوا میں سانس بھی نہ لے --- اس نے ماسک آگے بڑھاتے ہوئے کہا سر سوری اس کے بغیر آپ اندر نہیں جا سکتے -- اس نے ایک غصے بھری نگاہ گارڈ پر ڈالی اور ماسک لے لیا- رات واپسی پر باہر ایک اچھے ریسٹورنٹ پر کھانا کھایا اور واپس آگئے -- ہسپتال میں ایمبولینس کے سائرن -لوگوں کی بھیڑ -شور وغل کہیں سسکیاں، آہیں چیخ و پکار- اکھڑتی سانسیں دم توڑتی روحیں- نجانے کتنی ماؤں کی گود اجڑ گئی- کہیں آہ و بکا ہمارے بچوں کو چیک کر لو- تو کہیں ماں کو بچانے کے لیے ہاتھ جوڑتی ہوئی بیٹی دم توڑتے ننھے پھول. ،جوان بیٹوں کی لاشیں جن کا آخری دیدار بھی والدین کو نصیب نہ ہوا، جان سے جاتا ہوا- جوان بھائی جو کتنوں کی امید تھا نظروں کے سامنے کتنے سہاگ اجڑ گئے کتنے چمن لٹ گئے ،کہیں سسکتی بلکتی بیوائیں ، کہیں باپ کی لاش کو کندھا دیتی کمسن بیٹیاں- آنکھوں کے سامنے اجڑتے ہوئے چمن ہونے جلتے ہوئے شمشان کا اشارہ تھے -- کتنے لوگ لاوارث دفنائے گئے کوئی کندھا دینے کو تیار نہ تھا انسانیت کے بھی رشتے ناطے دم توڑ گئے- کرونا قہر بن کر ٹوٹا تھا - - - ڈاکٹر اور نرسز واحد سہارا تھے- جو جان کی بازی لگا کر اپنے فرض کو نبھانے کی کوشش کر رہے تھے وہی ہمدرد. غمگسار اور مسیحا- یہی وہ واحد رشتہ تھا جو مرتے دم تک لوگوں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگائے ہوئے تھے-- لوگ بے بس تھے وہ اپنے مال و متاع یہاں تک کہ آج اپنی سانسیں بھی پیاروں پر وار دینے کے لیے تیار تھے ---ہائے یہ بے بسی ----- ہر طرف قیامت برپا ہے- --- یہ سارا منظر اسکی آنکھوں میں منڈلا رہا تھا اسد جو آج وینٹی لیٹر پڑا زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا- اور آنسو کی لڑیاں قطار در قطار اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں- نجانے یہ ندامت کے آنسو تھے یا درد کی کڑواہٹ، کسی اپنے سے بچھڑ جانے کا دکھ -----یا شاید پچھتاوا-----

☆☆☆☆☆

یہ کہاں نصیب میرے.....

ہر برس سردیوں اور گرمیوں کی آمد اور رخصتی پر موسم کی مناسبت سے کپڑے جوتے اور دیگر سامان کھولنا اور بند کرنا مجھے بہت مشکل سا کام لگتا ہے۔ سٹوریج کے مسائل مجھے فیز 4 کے گھر میں سدا ہی درپیش رہے۔ ہر ایک گھر میں ہر ایک شخص کی زندگی کے لیے روزمرہ کا بہت ساز و سامان موجود ہوتا ہے، پچھلے پانچ چھ برس سے ہر بار جب ہماری الماریوں میں بھاری سامان کے لئے بنائے گئے خانے جو ہینگر والی جگہ کے اوپر کے بڑے بکسے ہیں جن میں ہم وہ سامان رکھتے ہیں جسے موسم کے بدلنے پر نکالا اور رکھا جاتا ہے، وہاں مجھے ایک بڑا سا شاپر جس پر کافی سخت گرہ لگی ہوئی ہے، پڑا ملتا ہے، جسے دیکھ کر ہر بار بہت سی یادیں تازہ ہونے کا موقع بن جاتا ہے۔ ہر اگلی بار میں بھول چکی ہوتی ہوں کہ اس شاپر کی گرہ میں کیا پڑا ہے کیونکہ اس قسم کے اور بھی بہت سے شاپروں میں رکھا یہ ایک شاپر پچھلے بہت برسوں سے کسی استعمال میں نہیں لایا جا سکا۔ ہر بار وہ گہری سخت گرہ کھلتی ہے اور مجھے اس میں سفید سفید رنگ کے لٹھے کا کپڑا دکھائی دیتا ہے اور میں سیڑھی پر چڑھے ملازم کے پوچھنے پر اس لفافے کو پہچان کر کھولنے کا کہتی ضرور ہوں، وہ مجھے اس میں موجود سفید کپڑوں کی جھلک دکھاتا ہے اور میں اسے کہتی ہوں ''ٹھیک ہے ٹھیک ہے'' اسے گرہ لگا کر وہیں رکھ دو'' اس لفافے میں محفوظ ہمارے اپنے لئے سنبھالے کفن کے کپڑے نہیں ہیں بلکہ یہ وہ احرام ہیں جو ہم نے خانہ کعبہ کے طواف کے دوران پہنے تھے یہ احرام ہمیں نوید کے کلاس فیلو پرانے جگری دوست میاں انجم نے مہیا کیے تھے۔ ۲۰۱۵ میں جب میاں انجم نے سنا، جنھیں ہمارے گھر میں میاں کے نام سے ہی جانا اور پکارا جاتا ہے، کہ ان کا دوست نوید افضل اور بیگم رخشندہ نوید عمرہ

رخشندہ نوید

کے لیے جا رہے ہیں تو پہلے تو اس نے مونہہ میں انگلی چبالی لیکن یقین آجانے کے بعد کمال سخاوت اور محبت سے کہا کہ تم کو احرام خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس پڑے ہیں جو ہم نے اپنے عمرے کے وقت خریدے تھے بس وہی لے لو کیونکہ اس کے بعد تو ان کا کوئی مصرف بھی نہیں ہوتا اور میں یعنی رخشندہ نوید جس نے پوری زندگی میں کبھی کوئی بڑی چادر سر پر یا بدن پر نہ اوڑھی بس ایک واجبی سا برائے نام دوپٹہ جس کا اصل مقصد کہ "اپنا بدن ڈھانپو" شائد وہ بھی کبھی مروجہ انداز میں پورا نہ ہو سکا۔ دیکھا جائے تو میں نے ہمیشہ برائے نام بس ایک لباس کے اہم جزو کے طور پر دوپٹہ اوڑھا۔ سو میں اِدھر اُدھر عمرہ پر پہننے کے لئے عبایا یا برقعے تلاش کر رہی تھی۔ کہ میاں صاحب نے نوید کے لیے مکمل دو پیس احرام بھیج دیا مگر میرے لیے سفید کاٹن کا برقعہ نما احرام بھیجا جو صرف ون پیس تھا برقعے کے جزو اول جو سر پر باندھنے کے کام آتا ہے مجھے صرف وہ بھیجا۔ دوسرا شائد وہ کسی اور کو تحفہ کر چکے تھے۔ اس کی بس اتنی ہی لمبائی تھی کہ میری کمر کے خم اس میں چھپ جائیں۔ جو حسن کمر سے نیچے کی گولائی میں قدرت نے رکھا ہے اُسے ڈھانپنے کا مرے پاس اس وقت تک کوئی سامان نہیں تھا۔ مری چال پر کالج کے زمانے میں جب میں فرسٹ ایئر میں تھی، تو ایک شرارتی فورتھ ایئر کا ٹولہ مرے پیچھے اونچی آوازیں لگایا کرتا تھا۔ میں فرسٹ ایئر کی سیدھی سادھی جھوم جھوم کر چلنے والی اپنی دھن میں مست لڑکی تھی۔ اس آٹھ دس لڑکیوں کے گروپ کی ایک سٹوڈنٹ روزینہ سے میری دوستی یوں ہوئی کہ فرسٹ ایئر میں ہی شاعرہ مشہور ہونے کے ناطے وہ سٹوڈنٹ میرے پاس اپنے ایک ذاتی اور پرائیویٹ کام میں مدد و معاونت حاصل کرنے کی غرض سے آنے لگی۔ اس کا مسئلہ کچھ یہ تھا کہ وہ بہت بری طرح ایک لڑکے کے عشق میں مبتلا تھی اور وہ ہر دوسرے دن ایک خط لکھوانے کے لیے مرے پاس آتی اور میں اسے خوبصورت مرصع اردو میں اشعار سے مزین تحریر لکھ کر تھما دیتی۔ اکثر وہ خطوط لکھتے ہوئے میں خوفزدہ ہونے لگی کہ کہیں روزینہ کے محبوب سے مجھے بھی قلبی لگاؤ نہ ہو جائے۔ اس قدر دل کے سچے جذبات سے بھرا ہوا پیغام پہنچاتے ہوئے اکثر قاصد کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ ہر بار مجھے خط میں مختلف پیام بھرنا ہوتا تھا، کبھی وہ روٹھا ہے تو اسے منانا ہوتا، کبھی اس کی یاد ستاتی ہے تو ملنے کا سندیس دینا ہوتا تھا۔ کبھی بری طرح کے جھگڑے اور لڑائی کا جواب دینا ہوتا، بس روزینہ مجھے لاہور کالج کے خوبصورت گراونڈ یا کسی راہداری میں گھیر لیتی، اولڈ ہاسٹل کی چھت کو بھی اس قلبی تحریر کو سپرد قلم کرنے کے لئے چن رکھا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے

افسانہ نگاری کا آغاز بھی کیا تھا اور میں سمن آباد کی کالج بس سے واپسی پر گھر جاتے ہوئے دو سٹاپ پہلے اترنے لگی تھی اور سمن آباد پونچھ روڈ گول چکر کی دکانوں کے بیچ سے سیڑھیاں چڑھ کر چلمن کے دفتر کے چکر لگانے لگی تھی اس گول چکر پر برسوں سے ٹائپسی نامی برگر شاپ ہے جہاں سے میں آج بھی کبھی کبھار برگر پیک کروا کر گھر لے جاتی ہوں چلمن اس زمانے کا مشہور ادبی رسالہ تھا۔ سمن آباد میں اردو ڈائجسٹ کا دفتر بھی تھا اس کے پھیرے بھی میں نے اسی زمانے میں لگائے۔ مگر چلمن چونکہ بلکل مرے راستے میں تھا اس لئے چلمن کے ایڈیٹر فریدالدین احمد صاحب نے مری شاعری اور افسانے چھاپنے شروع کر دیئے۔ یہ افسانے خالصتاً قلبی وارداتوں سے وابستہ تھے۔اسی لئے روزینہ کے محبوب کو شدید جذباتی تحاریر لکھنے میں مجھے قطعاً مشکل پیش نہ آئی بلکہ میں اس سے دھیرے دھیرے محذوذ ہونے لگی۔ایک برس کے بعد روزینہ کالج سے بی اے کرنے کے بعد نا جانے کہاں گئی، خدا معلوم اس کے عشق کی داستان کسی کنارے لگی یا ادھوری رہی، روزینہ اور اس کا یہ گروپ جب میں لاہور کالج کی راہداریوں سے گزرتی تو اکثر یہ گانا گایا کرتا۔ ''یہ چال مستانی مدہوش کیے جائے'' دراصل قدرت نے عورت کے وجود میں چند مقامات کو خاص کشش عطا کر رکھی ہے۔جو فرنٹ اور پشت کے ابھار میں یکساں موجود ہے۔ سو میاں انجم صاحب کا مہیا کردہ سفید احرام کہ جس کا نچلا حصہ موجود نہیں تھا اور جس کے تحت مری مستانی چال اور پشت میں قدرت کی جانب سے عطا کردہ کشش کو چھپانے کا تا حال کوئی موزوں سامان میں ڈھونڈ نہ پائی تھی۔ سو کچھ زیادہ کٹر مذہبی نہ ہونے کے سبب اسی سر سے کمر تک کے احرام پر ہی اکتفا کر بیٹھی۔ مرے برعکس میری ماں ایک عمر سے ایک بڑی چادر جو تقریباً سر سے پاؤں تک ہوتی تھی، جس کا ارض شاید پونے تین گز ہوتا تھا اور تین گز لمبائی، جس سے پورے بدن کے گرد احاطہ ہو جاتا اور وہ چادر پردے کے اغراض و مقاصد پر پوری طرح پورا اترتی تھی۔

میں عمرے پر جانے سے پہلے ماں سے مل کر ان سے دعائیں لینے گئی تو انھوں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ تو اللہ کے گھر جا رہی ہے اس ایکٹنگ سے باز آ، اور ساتھ ہی مجھے ایک ہرے رنگ کی چادر دی جس پر آف وائٹ رنگ کا کچھ تجریدی پرنٹ تھا اور ساتھ نصیحت کی کہ اسے عمرہ کے دوران پہننا اور مری سیڑھیاں اترتے منت کے لہجے میں بولیں کہ اسے روضے کی جالی سے مَس کر کے لانا۔

مری امی اور ابو کو میرے بھائی ظفر نے اپنے سعودیہ میں جاب کے دوران حج کروایا تھا۔ بقول امی یہ حج انہوں نے بہت شاہانہ

طریقے سے کیا تھا۔ ظفر بھائیوں میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس نے بڑے شوق سے بہت چھوٹی عمر میں کمانا شروع کر دیا تھا۔ سعودی عرب میں کچھ سال نوکری کے دوران اُس نے ماں باپ کو حج کرانے کا احسن فریضہ بھی سرانجام دیا۔ ہمارے ابو حج سے لوٹے تو انہوں نے کچھ اپنے سفر کی اتنی اچھی رپورٹ نہیں دی تھی۔ اور انھیں دوران حج ہو جانے والی تھکن، گرمی اور مختلف فرائض کی ادائیگی کی مشکلات نے کافی ناخوش کیا تھا اور ہم ابو کی باتیں سن کر خوب ہنسے تھے۔

ابو کو میں نے تمام عمر صبح کی اذان کے وقت جاگتے دیکھا۔ گھر میں اندھیرا چھایا ہوتا اور ابو نماز کے بعد صبح کی سیر کی تیاری میں مصروف ہوتے سردیوں میں لمبا چسٹر، گرم ٹوپی اور دستانے پہنے ہوئے اور ساتھ ساتھ باآواز بلند ورد کرتے ہوئے ''مالک رحم کر، اللہ رب العزت کرم فرما'' یا اللہ بخش دے'' اے غفور الرحیم رحمت فرما'' اسی طرح کے تین چار جملے روزانہ نمازوں کے وقت ہمارے گھر میں گونجتے۔ حالانکہ ہم بچے نمازوں کے کچھ خاص پابند نہیں تھے۔ انھوں نے ہمیں کبھی مجبور نہیں کیا۔ سب نے بڑے ہوتے ہوتے اپنی عقل اور اپنی مرضی کے مطابق خود کو راغب کیا۔ جس نے نماز پڑھنی چاہی اس نے نماز پڑھی۔ ہماری آپی جان نماز روزہ کی بڑی پابند تھیں۔ اور مری بہن ثمینہ بھی اسی زمانے سے پابند صوم الصلوٰۃ تھی۔

امی کو عین جوانی میں ایک بار پاکپتن جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک پیرنی صاحبہ ہمارے گھر آئیں تھیں ان کے ساتھ ان کی مریدنیوں کا ۲۰ خواتین پر مشتمل قافلہ تھا مرید خواتین کی سردار پیرنی صاحبہ کا رنگ کسی سرخ و سفید پٹھان یا یورپین خواتین کا سا تھا۔ شاید ان کا تعلق مانسہرہ سے تھا اس زمانے میں خواتین پیرنیوں کا بہت دور دورہ تھا۔ ہماری والدہ ان کے قافلے کے ساتھ پاکپتن گئیں تھیں۔ چند دن کی زیارتوں اور پاک پتن کے بزرگ بابا فرید گنج شکر کے مزار پر رہنے کے بعد جب وہ واپس لوٹیں تو ہم سب بچوں سمیت ہمارے ابو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ امی کے اندر سے ایک اور دوسری عورت، کا جنم ہو چکا تھا۔ امی حد درجہ پردہ دار، شدید عبادت گزار ہو کر واپس آئیں۔ وہ سر سے پاؤں تک چادر اوڑھے تھیں اور اپنا چہرہ نامحرم کے لیے حرام کر بیٹھی تھیں بقول والدہ انھیں کچھ حاصل ہو چکا تھا۔ ان کے جانماز پر ستارے چمکنے اور روکھائی دینے لگے تھے۔

ابو نے کچھ برس تو امی کا یہ روپ برداشت کیا۔ لیکن پھر وہ تنگ پڑنے لگے۔ اکثر وہ کہا کرتے۔ ''بی بی اس طرح رب نہیں ملنا تو چوبیس گھنٹے مصلے پر بیٹھی رہتی ہے'' اب بس کر دے۔ بہرحال امی نے ایک دن میں قرآن پڑھنے کا ریکارڈ قائم کرنے کے

ساتھ معلوم نہیں پانچ نمازوں کے علاوہ ایک ہی دن رات میں ہزاروں نفل ادا کرنے کا ذمہ بھی اپنے سر لے رکھا تھا۔

ہم بہنوں میں آج کی تاریخ تک کسی کو یہ بات وراثت میں نہیں مل سکی۔ نہ ہی ہم نے اپنی والدہ کو کاپی کیا۔

میں اللہ پر راسخ ایمان اور حب نبیؐ سے شدید لبریز ہونے کے باوجود خود کو ان چیزوں میں داخل نہ کر سکی حالانکہ میں نے اپنے اردگرد اسی ماحول کو پایا۔

میری اکثر اپنی آپی سے مزاروں پر جانے کے موضوع پر بھی بحث ہو جایا کرتی۔ میں شاید اپنی شادی سے پہلے کسی وقت اپنی امی کے ساتھ داتا کے دربار گئی ہوں۔ اُس کے بعد نوید افضل بھی کچھ مرے جیسا ہی نکلا تھا۔ سو ہم نے بس اپنے مالک کل اپنے رازق و مالک سے سیدھی لو لگا رکھی تھی۔

2015 میں مَیں ٹی۔ این۔ ایس جائن کیے ہوئے شاید کچھ ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک شام محمد مختار علی کا جدہ سے فون آیا جنھوں نے مجھے جدہ میں ہونے والے کل پاکستان مشاعرہ کا دعوت نامہ پہنچایا وہ ملتان کے رہنے والے ہیں اور کئی برس سے جدہ میں بہ سلسلہ روزگار مقیم تھے، وہ کسی ترک کمپنی میں بطور آرٹ ڈائریکٹر کام کر رہے تھے۔ مختار کی کیلیگرافی کے ہنر و فن سے فیس بک کے ذریعے میں پہلے سے واقف تھی۔ وہ اس مشاعرے کی انتظامی کمیٹی کے اعزازی سیکریٹری تھے اور انہوں نے وہاں اس مجلّے کی ادارت بھی کی جس میں اس مشاعرے کی خوبصورت تصاویر اور روداد چھاپی گئی۔ اس مشاعرے کے منتظمین میں وہ سرفہرست تھے۔۔ مختار نہایت بھلے مانس، شریف النفس انسان انہوں نے پورے ٹرپ میں ہمارا اتنا خیال رکھا اس طور مہمان نوازی کی جیسے ہم ان کے گھر کے مہمان ہوں۔

نوید افضل نے پہلی بار مرے کسی مشاعرے کے معاملات میں دخل اندازی کی اور جدہ مشاعرہ کی دعوت کا سن کر برملا کہا کہ اپنے منتظمین سے پوچھو میں بھی عمرہ کرنا چاہتا ہوں میں اپنا خرچہ خود اٹھا لوں گا۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اور افضل نوید کبھی زندگی بھر اتنی ہمت نہ کرتے اور عمرہ کی ادائیگی کا قصد بہ اہتمام خاص مشکل سے ہی باندھتے۔

مختار مجھے بتا چکے تھے کہ جدہ مشاعرے کا فرنج بینیفٹ یعنی سفرِ عمرہ اس مشاعرہ پیکیج میں شامل ہے۔ مرے پوچھے بغیر ہی انہوں نے خوش خبری سنا دی تھی کہ آپ سب شعرا کو عمرہ کی سعادت کے لیے لے کر جائیں اس مشاعرے کا حصہ ہے۔

میں نے مسٹر بارنس، ٹی این ایس کے پرنسپل کو ای میل ڈالی کہ سر میں مشاعرہ پڑھنے جدہ جانا چاہتی ہوں ایک ہفتہ کی چھٹی درکار ہے۔ مسٹر بارنس نے میرے اس بین الاقوامی ٹرپ کو ادارے کے لیے

پرائڈ کا سبب تسلیم کیا اور چھٹی آرام سے مل گئی ہر بار جائے شکرانہ پر وہی اپنے شعر والی بات دہرانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے:
اور کیا تو چاہتی ہے چار شعروں کے عوض

یہ مشاعرہ کونسلیٹ جنرل جدہ کے زیر اہتمام ہو رہا تھا - اس وقت کے کونسل جنرل محترم آفتاب احمد کھوکھر نے مشاعرہ کے اعلیٰ ترین انتظامات یعنی ہماری دیکھ بھال، قیام وطعام کی خود نگرانی کی- میری ان سے آج بھی نئے سال اور عیدوں پر میسج کے راستے بات ہوتی ہے، نہایت باوقار شخصیت جن کے گھر لنچ پر ہم تمام معزز شعرا مدعو کیے گئے تھے ان کی مسز بھی باذوق خوش مزاج خاتون تھیں - میں نے انھیں اپنی کتابیں پیش کیں - نوید الفضل کی کونسل جنرل سے خوب گاڑھی چھنی - نوی نے فوراً اپنی بیٹی کے سول سرونٹ ہونے کی شیخی داغی اور ساتھ ہی اپنی بھتیجی جو فارن سروس میں ہے اس کا تعارف بھی کروا دیا- اتفاق سے آفتاب کھوکھر اس کو جانتے بھی تھے-
بدھ کے روز ہماری فلائٹ تھی ایمیریٹ کے جمبو جہاز میں نہایت مزیدار سفر رہا لاہور سے عباس تابش بھی اسی فلائٹ میں موجود تھے- ہوٹل میں رات کے ڈنر پر دیگر تمام شریک شعرا سے ملاقات ہوئی اور منتظمین سے تعارف ہوا- جس ہوٹل میں ہمارا ٹھہرانے کا انتظام تھا- یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ ۷ ستارا تھا یا اس سے کم زیادہ، مگر وہ نہایت آرام دہ جگمگاتے فانوسوں سے مزین طویل رومانٹک شاندار لابی کا ماحول تھا جہاں ہم سب ڈنر کے بعد اکٹھے لابی میں بیٹھ گئے اور بہت سی یادگار تصاویر بنائی گئیں-
جدہ میں مشاعرہ پڑھنے کی خوشی اُن باقی بیرون ملک مشاعروں کی مسرت سے بڑھ کر اسی لیے تھی کہ مدینہ اور مکہ پر قدم دھرنا بھی اس سفر میں شامل تھا- میں اپنی نعتوں اور حمد لکھتے ہوئے زیارت کعبہ اور دیدار مصطفیٰ کے نعرے لگاتے رہنے کے باوجود یاد نہیں کر سکتی کہ کبھی شدید عمرہ یا حج کی کوشش وکاوش میں مصروف رہی ہوں- ہاں دل کی بات اللہ اور اس کا نبیؐ ہی جانتا ہے کچھ تو تھا جس سبب مجھے بلاوا آ گیا- مگر یہ سچ ہے نعتیں لکھتے ہوئے مجھ پر وجد ضرور طاری ہو جاتا ہے سو کوئی تو بات ہو گی جو مجھے دیار نبی سے بلاوہ آ گیا:

بلائے دیں کے سبھی معجزات جانتی ہے
مرے نبیؐ کو یہ کُل کائنات جانتی ہے

یہ آرزوئے مدینہ ہے ایسی نعمت کو
میں جانتی ہوں مرے رب کی ذات جانتی ہے

نثار ایک نہیں صرف میری جاں اُنؐ پر
زمیں کے ساتھ فِدا سات آسماں اُنؐ پر

یہ میں نے دیکھا کہ دیوانہ وار شام و سحر
درود بھیجتی رہتی ہے میری ماں اُنؐ پر

جو نعت میں جلوہ گر ہے جذبہ، قبول کر لیں
حضور ناچیز کا یہ تحفہ قبول کر لیں

میں کارِ دنیا کی رسیوں میں بندھی پڑی ہوں
مری عبادت کا ہر ارادہ قبول لیں

چرچے مرے نبی کے ہر آن ہو رہے ہیں
قرآن کے معانی آسان ہو رہے ہیں

کس آنکھ سے کریں گے دیدار خاک طیبہ
یا رب خطا ہمارے اوسان ہو رہے ہیں

لکھو وی جھولی وچ آ کے کرم دے باج نہ آوے
اک اوای تھاں اے جتھوں منگدیاں لاج نہ آوے

اندھیروں میں جگنو سمیٹے کھڑی ہوں
کرم ان کے ہر سو سمیٹے کھڑی ہوں

کھڑی ہوں میں روضے کی جالی سے لگ کر
میں خوشبو خوشبو سمیٹے کھڑی ہوں

بدھ کے روز ہم نے ہوٹل میں قیام کیا۔ ہمیں رات ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ کل صبح سویرے مکہ روانگی ہے۔ سو صبح سویرے نوید افضل نے خشوع و خضوع سے نماز پڑھی اور عمرہ کی سعادت سے پہلے ہی شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ باتھ روم سے جب وہ احرام پہن کر نکلے تو میں نے انہیں بڑے ہائی سپرٹ میں دیکھا۔ میں ان کو دیکھ کر ہنس پڑی میں بھی اپنے نام نہاد احرام کے ساتھ شرمندہ شرمندہ بس میں بیٹھی کیونکہ فاطمہ حسن اور نصیر ترابی صاحب کی بیگم ماہرہ نصیر نے فل سرتا پا سیاہ عبایا پہن رکھے تھے۔ اپنے پروٹوکول آفیسر نصراللہ خان کی معاونت میں جدہ سے مکہ کا سفر آغاز ہوا۔ اس سفر کے دوران خوب ہنسی مذاق گپ شپ جاری رہی کچھ ایسے شعرا تھے جن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی رسا چغتائی کی خاموش اور دھیمی طبیعت نامحسوس سی تھی لیکن ان کی شاعری پر میں ہمیشہ سے وارفتہ رہی ان سے پہلے اور آخری ملاقات بھی اسی مشاعرے کے صدقے نصیب ہوئی۔

کوہاٹ کے شاہد زمان صاحب نے اپنی بلند آہنگ اور بذلہ سنجی سے رونق لگائے رکھی۔ میں شائد کچھ معاملات میں بہت حساس ہوں۔ ان سے بات کے دوران کچھ ناگوار باس کے باعث ناخوشگواری کا جھونکا محسوس ہوتا تھا۔ ایسی تکلیف شاید معدہ کی وجہ سے ایک دو بار نوید کو بھی ہوئی مگر میں تو شور مچا مچا کر اس کو ٹھیک کایا کرتی رہی۔ شاہد زمان بہت خیال رکھنے والی شخصیت تھے نوید سے ان کی کافی گپ شپ رہی۔ کوئٹہ سے بیرام غوری سے بھی پہلی ملاقات

تھی اگر بری بڑی سوئی ہوئی زرا مختلف آنکھیں کسی انجانے نشے کی زد میں محسوس ہوتے تھے بہت دھیما بولنے والے اور بہت اچھے شاعر۔ آج بھی ان سے فیس بک پر رابطہ قائم ہے۔ایک اور ایسی شخصیت سے پہلی بار ملاقات ہوئی جن کا بہت چرچہ سن رکھا تھا وہ تھے نصیر ترابی صاحب، ان سے اور ان کی بیگم ماہرہ سے مری دوستی خوب قائم ہوئی۔ ان سے مری دوسری ملاقات امریکہ کے مشاعرے پر ہوئی وہاں ایک دوسرے کو ہم نے دیکھا تو اڑ کر ایک دوسرے کو ملے۔ نصیر ترابی صاحب کو امریکہ میں میں نے علیل پایا اور مجھے محسوس ہوا کہ انہیں اس حالت میں مشاعرے کی مشقت سے اجتناب برتنا چاہیے تھا، مگر شائد مشاعرہ پڑھنا بھی ایک لت ہے۔ جس میں میں خود بھی مبتلا ہوں۔ باقی تمام شعرا سے میں برسوں سے میل ملاقات کا لطف اٹھاتی رہی تھی۔افتخار عارف صاحب ہمیشہ سے مرے مہربان جن کی کتابیں مرا اثاثہ ہیں، مری کتابوں کی اسلام آباد میں تقاریب پر صدارت فرما چکے ہیں ان کی اس ایک نصیحت کو میں نے پلّے باندھ رکھا ہے جو انھوں نے مری دوسری کتاب (کسی اور سے محبت کی) کی تقریب پر عطا کی تھی۔ کہ ''رخشندہ سے مری درخواست ہے کہ وہ اپنی شاعری میں موجود poetic innosence کو کبھی ختم نہ ہونے دے۔'' اور میں نے ان کی نصیحت کو پلے سے باندھ لیا۔

انور مسعود صاحب سے بھی محبت کا سلسلہ پرانا تھا۔ وہ کبھی کبھی لاہور آنے پر مجھے فون ضرور کرتے رہے تھے اور میرے نام یعنی رخشندہ کو شامل کر کے کوئی فی البدیہہ شعر یا مصرعہ بنا کر مجھے سناتے۔ آج بھی ان سے ملاقات خوب رہتی ہے۔ان کی بیگم سے مری بہت دوستی رہی ایک بار ہم سکردو کے مشاعرے پر بھی اکٹھے تھے۔اس سفر میں دو ایک بار بسوں میں میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اترنے چڑھنے میں مدد کی تو انہوں نے مجھے دعا دی ایک دو بار مجھ سے اظہار محبت بھی کیا کہ آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ فاطمہ حسن بھی میری پرانی دوست وہ بھی کراچی میں مری شاعری کی کتابوں کی تقاریب میں ہر بار مضامین لکھنے اور مجھے محبت اور تعریف و تحسین کا تحفہ پیش کرنے میں سب سے آگے آگے رہیں۔

فاطمہ کے ساتھ بہت سے مشاعرے پڑھے۔ مرے کراچی جانے پر ہمیشہ فاطمہ نے کھانے اور ملاقاتوں سلسلہ جاری رکھا۔ وہ بہت کھلے دل کی مالک ہیں اور کشادہ دلی سے مرے اشعار کی تعریف کرتی ہیں۔ لاہور ان کی کم کم آمد پر میں ان سے ملاقات کا اہتمام کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں ان سے مرا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ تابش صاحب ہمیشہ سے دل کے قریب رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا سحر مجھ پر بری طرح

تب بھی طاری تھا آج بھی متاثر ہوں، دوستوں کے دوست خواتین کے ساتھ یوں بھی وہ احتیاط اور احترام برتتے ہیں مگر مجھ سے خاص احترام سے پیش آتے ہیں۔ خالد مسعود صاحب سے بھی مراقلبی ناطہ ہے۔ مری پنجابی کتاب کی ملتان میں رونمائی پر ان کی شمولیت نے مرے خون میں اضافہ کیا تھا۔

جدہ سے مکہ رواں دواں اس بس میں ہم ایک دوسرے کے قریب قریب بیٹھے تھے سب آپس میں گھل مل گئے تھے۔ راستے میں دو جگہ اتر کر کھانا پینا چائے پانی کیا گیا۔ سگریٹ پینے والوں نے سگریٹ کا نشہ پورا کیا۔ ہمارے اس بس میں پروٹوکول آفیسر نصراللہ خان بہت دلچسپ اور بہت عمدہ مزاج شخص تھے۔ جو بعد میں مرے فیس بک فرینڈ بھی بن گئے۔ نوید سے ان کی خاص گپ شپ رہی۔ ہمارا قافلہ خانہ کعبہ میں داخل ہو چکا تھا۔ دور سے کعبہ کی جھلک دیکھی تو دل زور سے دھڑکا۔ میں دیکھتی رہ گئی اور اللہ کے گھر میں خود کو موجود ہونے کا یقین کروایا۔ کعبے سے نظر ہٹی تو نگاہوں کو کعبہ کے گرد کھڑی بلند و بالا عمارات نے گھیر لیا یہ تمام عمارات کعبے یعنی اللہ کے گھر سے بھی بلند جدید ترین ہوٹل تھے جن میں صاحب استطاعت حاجی حضرات قیام فرماتے ہونگے۔۔ مجھے ان عمارات کو دیکھ کر تھوڑا سا جھٹکا ضرور لگا باقی تو سب ٹھیک ہے مگر کعبے کی سطح بلندی برابر یا اس سے سے زیادہ اونچی جگہ پر ہوٹلوں کے بیت الخلا کم ازکم مجھے بے حرمتی محسوس ہوئی۔ مگر میں نے اس دم خود سے کہا (رخشندہ نوید تو صرف کعبے پہ نظر رکھ) کعبے کے داخلی دروازے کے سامنے ہم سب جمع تھے اور نصراللہ خان کی ہدایات بغور سن رہے تھے۔ ہم سب کو ایک ایک سم رابطے کے لئے دے دی گئی۔ طے یہ پایا کہ مغرب کے وقت اسی دروازے کے قریب سب کو جمع ہونا ہے تاکہ اسی بس میں ہم واپس اسی شام جدہ روانہ ہو جائیں۔ یاد رہے کہ اصل میں ہمیں مشاعرہ پڑھنے کے لئے بلایا گیا تھا۔ اور اس کا وقوع پزیر ہونا ابھی باقی تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تو بس کعبے کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ یوں بھی مجھے معلوم تھا کہ یہ شاید مرا دیدار اول اور آخری دیدار بھی ہے۔ سیاہ رنگت کی اہمیت اور چمک کا اندازہ اسی روز ہوا۔ طواف گاہوں کے بیچ و بیچ کعبہ جگمگا رہا تھا۔ اب یہ طواف گاہ فقط ایک دائرہ نہ تھا بلکہ میں دیکھ کر حیران ہوئی کہ تین منزلہ برآمدوں کی تعمیر نے طواف کے رش کو کم کر دیا ہے مگر یہ تینوں منزلیں ہمیں کھچا کھچ بھری ہوئی ملیں۔ قافلے کے افراد آپس میں بٹ گئے اور دو دو کے جوڑے بن کر ایک دوسرے کو سنبھالنے کا عہد کرتے ہوئے عمرہ پر روانہ ہوئے۔۔ میرے ساتھ مرا محرم افضل نوید رہ گیا۔ اس نے طواف کے دوران میرا ہاتھ اپنے ہاتھ سے باندھ کر رکھا۔ اس رش میں شاید ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کے بعد ڈھونڈنے سے قاصر ہوتے کیونکہ دوران

طواف ہم ایسے میلے میں گم ہو جانے کیلئے قدم بڑھا رہے تھے جہاں ہم خود گم ہو جانا چاہتے تھے اور اسی فضا میں تحلیل ہونے کی خواہش تھی۔

طواف کے لئے قدم سوئے کعبہ رواں تھے خواہش تو سر اٹھا رہی تھی کہ کاش ہمیں کعبہ سے بس چند قدم دوری طواف کی جگہ ملے۔ کاش ہم کعبہ کی طرف ہاتھ بڑھائیں اور اس دوران غلاف کعبہ کو چھو کر دیکھ پائیں۔۔ لیکن گراؤنڈ فلور کھچا کھچ بھرے ہونے کے باعث ہمیں مجبوراً دوسرے فلور پر طواف کرنے کی جگہ ملی۔ پنکھوں کا موثر انتظام ہونے کے باعث گرمی کا احساس رتی بھر نہیں تھا۔ نوید نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا اور ہم ان زائرین کے ریلے میں شامل تھے جو اس مقام پر اپنی عاجزی سمیت حاضر تھا۔ وہاں کوئی امیر تھا نہ غریب سب نے ایک ہی سفید لباس پہن رکھا تھا۔ وہاں رنگ و نسل کی قید سے جدا ہر قوم، ہر فرقے، ہر ملک، ہر براعظم سے مسلمان طواف میں شامل تھے۔ میں بخوبی پہچان رہی تھی کہ کون افریکہ سے آیا اور کون جاپان سے۔ ترکی اور ایران کے بہت سے زائرین پورے پورے خاندان کے ساتھ بمعہ اہل و عیال آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان سے آنے والے بھی اپنی زبان اور لہجے سے پہچانے جا رہے تھے۔ ہزاروں چھوٹے چھوٹے بچے والد کاندھوں پر بٹھائے ہوئے، بیشتر بزرگ ماؤں کو ویل چیئر پر عمرہ کرواتے ہوئے دکھائی دیے۔ غرضیکہ مکہ کی دہلیز پر ہر عمر کا چہرہ موجود تھا۔ طواف کے دوران ایک مقام پر ہم بالکل خانہ کعبہ کے سامنے آ گئے کعبہ اپنی پوری آب و تاب سے تقریباً تین سائیڈ سے ہمیں دکھائی دے رہا تھا۔ اُس سے عجب سی حالت ہوئی۔ ہاتھ دعا کو اٹھے۔ آنسو رواں ہوئے اور میں نے کل عالم کے لیے دعا مانگی۔ تمام دنیا کے صدقے اپنی فیملی کی صحت و سلامتی، کامیابی اور طویل عمر کی دعا کی۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ دعا گویا لب سے نہیں بلکہ آنسوؤں کی زبانی مانگی جا رہی تھی۔ میں نے رب العزت سے دل کے دکھڑے پھولے، اپنی تین سرفہرست دعاؤں کے لئے میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک بچے کی طرح ضد کی اور بہ آواز بلند رو رو کر التجا کی۔ ان میں سے ایک دعا مرے لاہور قدم رکھنے کے چند روز کے بعد ہی پوری ہو گئی۔

نامیہ کی نوید کے بھائی ڈاکٹر اویس افضل کے بیٹے طاہر مقیم لندن سے 3 سالہ منگنی بوجوہ ٹوٹنے کے بعد میں جانتی تھی کہ نامیہ نے اپنی زندگی لندن کے مطابق پلان کر رکھی ہے اس نے سی ایس ایس کا امتحان نہیں دیا کہ مجھے تو لندن میں رہنا ہے۔ سو مالک نے عمرے سے واپسی پر آسمان سے ایک شہزادہ اتارا اور لندن کا ایک سیدھا سادہ نیک شریف لڑکا بھیجا جس کے والدین ملاقات اول میں ہی نامیہ کو ملنے نہیں بلکہ انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔

[جاری ہے۔]

کہانی

''کہانی سُنایئے ناں، پاپا! مجھے نیند نہیں آرہی''۔

''نہیں آج نہیں بیٹا، بہت تھکن ہوگئی آج تو۔۔۔''

''کیسے؟ کہانی کو؟''

''ارے نہیں، مجھے۔۔۔ دن بھر کی مصروفیات نے تھکا کر رکھ دیا ہے۔ یہ رپورٹ، وہ رپورٹ۔ یہ انٹرویو، وہ انٹرویو۔۔۔ کل سن لینا کہانی۔۔۔ ضرور سناؤں گا کل۔۔۔''

''یہ بات تو آپ نے کل بھی کہی تھی۔۔۔ مگر آج سنا نہیں رہے۔۔۔ بس آج تو میں۔۔۔''

''اچھا، بابا، اچھا۔ ویسے نیند میں تو تم بھی لگ رہے ہو۔۔۔ مگر ٹھیک ہے، کہو، کون سی کہانی سنو گے۔۔۔؟''

''کوئی سی بھی۔۔۔''

''پھر بھی، کچھ تو بتاؤ، کون سی کہانی، کس بارے میں؟''

''کسی کے بارے میں بھی نہیں۔۔۔''

''کسی کے بارے میں بھی نہیں۔''

''اوہو، بیٹا میرا مطلب ہے کیا کیا ہو اس کہانی میں، کون کون ہو اس میں۔۔۔؟''

''کوئی بھی نہ ہو اس کہانی میں۔۔۔''

''کوئی بھی نہ ہو!؟ کیا مطلب؟ یعنی بالکل خالی؟''

''ہاں، بالکل خالی۔۔۔ ایمپٹی۔۔۔ ای فار ایمپٹی۔۔۔''

''اوہ، اب سمجھا، تم ایک سادہ کہانی سننا چاہتے ہو۔۔۔ چٹی سفید۔۔۔ ہے ناں؟''

''نہیں، سفید بھی نہیں۔۔۔ کوئی رنگ نہ ہو اس کہانی کا۔۔۔''

چلو، رنگ نہ سہی۔۔۔ یہ تو بتاؤ دِکھنے میں کیسی ہو۔۔۔؟''

''کیسی بھی نہیں۔۔۔''

''اچھا چلو یہ بتا دو، ہو کتنی لمبی چوڑی۔۔۔؟''

''نہ لمبی ہو، نہ چوڑی۔۔۔''

''موٹی۔۔۔؟''

حامد یزدانی

”نہیں“۔

”گول ۔۔؟“

”نہیں“۔

تکونی ۔۔؟“

”نہیں“

”چوکور ۔۔؟“

”نہیں“۔

مستطیل ۔۔؟“

”نہیں ۔۔“

سٹار شیپ ۔۔۔؟“

”نہیں“۔

اچھا، ہارٹ شیپ میں چلے گی، ہے
ناں ۔۔؟“

”نہیں نہیں ۔۔ کسی شیپ میں
نہیں ۔۔“

”کسی شیپ میں نہیں؟ اچھا چلو یہ تو بتا دو
بال کیسے ہوں اس کے ۔۔۔؟“

”بال ہوں ہی نہ اس کے ۔۔۔“

”وہ تو پھر گنجی کہانی ہوگی۔ ہے ناں“

”پتہ نہیں۔“

”اور کان ۔۔ کیا کان ہوں اس کے؟“

”کان بھی نہ ہوں ۔۔۔“

”لمبے لمبے دانت ہوں اس کے ۔۔۔ خوف
ناک۔ ہے ناں؟“

نہیں، اس کے دانت نہ ہوں ۔۔“

ارے ارے اس کے دانتوں کے بغیر وہ
کھاتی کیسے ہوگی ۔۔؟“

”وہ کھاتی کچھ نہیں ۔۔۔“

”ہاتھ ہوں اس کے ۔۔؟“

”نہیں بابا نہیں ۔۔۔ کہا نا ۔۔ کچھ بھی نہ
ہو ۔۔۔“

”دیکھو، اگر کچھ بھی نہ ہو تو کہانی بنے گی
کیسے؟ کہانی کی کچھ شکل صورت ہوتی
ہے۔ اس میں کردار ہوتے ہیں، لوگ
ہوتے ہیں، چیزیں ہوتی ہیں، واقعات
ہوتے ہیں ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔“

”نہیں، اس میں کچھ نہیں ہوتا ۔۔“

”یہ کیسی کہانی ہوئی جس میں کچھ بھی نہیں
ہوتا ۔۔؟“

”کوئی سی بھی نہیں ۔۔“

”کوئی سی بھی نہیں ۔۔۔؟ تو بدمعاش کہیں
کے ۔۔ تم اتنی دیر سے کیا سننے کی ضد کر
رہے تھے ۔۔؟ کہانی نہیں تو پھر کیا
تم ۔۔۔ زونو ۔۔ زونو ۔۔ بیٹا ۔۔ سو گئے
کیا؟“

زونو سو چکا ہے
اور ۔۔۔ شاید میں بھی ۔۔۔
اور ۔۔۔ شاید سبھی ۔۔۔
مگر
کہانی جاگ رہی ہے
کیونکہ کہانی کی آنکھیں ہوتی ہیں۔
ہمیشہ کھلی رہنے والی آنکھیں ۔۔۔

☆☆☆☆☆

''میری امی ہیں'' [مائیکرو فکشن]

سلمان یوسف سمیجہ

ماں درمیان میں بیٹھی سویٹر بن رہی تھی، جبکہ اس کے دونوں جڑواں بچے اُس کے دائیں بائیں براجمان تھے۔ دونوں بچوں میں کسی بات پر تکرار ہوئی، پھر یہ تکرار لڑائی، میں بدل گئی، ماں انھیں چھڑانے لگی۔

میری امی میرا ساتھ دیں گی۔ ''پہلے بچے'' نے کہا اور ماں کو دیکھنے لگا۔ ''ہے نا امی''

''آپ میری ہیں ناں؟''

نہیں، یہ میری امی ہیں! ''دوسرے بچے نے'' ماں کا ہاتھ کھینچا۔

نہیں! میری امی ہیں''

''نہیں! نہیں، میری امی ہیں''

اب ان کے درمیان بحث ہونے لگی تھی۔ دونوں بچے زور لگا رہے تھے۔ ماں نے مسکرا کر سویٹر سامنے رکھی میز پر رکھا اور ان کی باتوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اب وہ انھیں چھڑا نہیں رہی تھی وہ انھیں چھڑانا چاہتی بھی نہیں تھی انھیں ایسا کرتے ہوئے دیکھتے رہنا چاہتی تھی۔ چہرے پر محبت بھری مامتا اور آنکھوں میں دنیا بھر کا پیار سموئے انھیں دیکھ رہی تھی دیکھتی جا رہی تھی۔

''میری امی ہیں''

''تمھاری نہیں میری امی ہیں!''

میں دونوں کی امی ہوں!'' ماں ہنسی، اس کی''

کھلکھلاہٹ میں بے حد پیار شامل تھا۔

''نہیں امی آپ صرف میری ہیں''

''نہیں جی میری امی ہیں!''

وہ دونوں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے ٹیلی ویژن پر اتفاقاً یہی ڈرامہ دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے گھر ساتھ ساتھ ہی تھے۔ بڑا بھائی اکیلا اپنے گھر میں بیٹھا دیکھ رہا تھا جبکہ اس سے تین سال چھوٹا بھائی، اپنی بیگم کے ساتھ بیٹھا دیکھنے میں مگن تھا۔

دونوں کی آنکھوں میں نمی ناچنے لگی تھی۔ ٹیلی ویژن کی سکرین سے نظریں اُٹھانے بلکہ چرانے کے بعد ان کے ذہنوں کی سکرین پر وہ اذیت ناک منظر چلنے لگا۔

بھائی صاحب! یہ آپ کی امی ہیں، آپ ہی انھیں ''اپنے گھر میں لے جائیے'' چھوٹے بھائی نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر بڑے بھائی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

نہیں۔ میرے گھر میں ان کے لیے جگہ ''نہیں، تم ہی رکھو انھیں، یہ تمھاری امی ہیں''۔ بڑے بھائی نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں، یہ آپ کی امی ہیں''

''جی نہیں، تمھاری ہیں''

اور امی دونوں ظالم بیٹوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ میں کس کی ماں ہوں آخر؟ کیا یہ میرے یہ بیٹے ہیں جو میرے دل پر لفظوں کے خنجر چلائے جا رہے ہیں؟ کیا بیٹے ایسے ہوتے ہیں؟

سوال، کانٹے بن کر اس کی روح میں چبھ کر روح کو جسم سے نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔

پھر مجبوراً ماں کو اولڈ ہوم میں ڈال دیا گیا، ماں اولاد کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور کچھ ہی دنوں بعد دم توڑ گئی، سوالوں کے کانٹوں نے روح میں چبھ چبھ کر روح کو نکال پھینکا تھا۔

دونوں مناظر دونوں بھائیوں کے منہ پر طمانچے بن کر لگے تھے، ایک منظر ٹیلی ویژن کی سکرین نے دکھا دیا تھا اور دوسرا منظر ضمیر نے!

دونوں کی آنکھیں ڈھیر ساری نمی، اُداسی اور پچھتاووں کی آماجگاہ بن گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆

مقدر [مائیکرو فکشن]

اس کے چاروں طرف خوابوں کی خوشنما جنت تھی۔ وہ خواب جو کبھی سوتے میں اسے مسکرانے پر مجبور کرتے اور کبھی اس کی کھلی آنکھوں کے آگے ٹھہر کر اسے ستاتے تھے آج پھر اُسے تنگ کر رہے تھے۔ اس خواب ناک دنیا میں داخلہ اس کے لیے اتنا آسان نہ تھا۔ چاروں اور کے خوابوں سے پہلے مسائل و مصائب کی سلاخیں تھیں۔ وہ اگر زندگی گزار رہا تھا تو صرف اپنے خوابوں کے سہارے ورنہ تو وہ زندگی کو طلاق دینے کا قصد کیے بیٹھا تھا کہ دنیا کے قفس سے چھٹکارہ اس کے نزدیک ہر سکون کی کنجی تھی۔

+++++++

وہ ایک عام سا نوجوان تھا جس نے بارہویں تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ نیا کرنے کا سوچا۔ نیا بھی صرف اس کے لیے اور اس کے خاندان کے لیے تھا ورنہ تو اس سے پہلے وہ کام یعنی کاروبار دنیا کا تقریباً ہر آٹھواں آدمی کر رہا تھا۔ کاروبار سے ان کے خاندان کا بیر شروع سے نوکریاں کرنے کی وجہ سے تھا۔ اسے ہر دوسرا بندہ مشوروں سے ایسے نوازتا تھا جیسے کہ ان کے مشورے کاتبِ تقدیر سے تصدیق شدہ ہوں اور ان میں ناکامی کی کوئی گنجائش ہی نہیں اسی لیے اس نے باپ سے پیسے لیے اور بسم اللہ پڑھی۔ خود کو تقدیر کے سپرد کر کے فیکٹریوں سے براہِ راست مال اٹھا کر دکانوں پر سپلائی کرنا شروع کر دیا۔ یہ کام اسے بہت آسان لگا تھا لیکن درحقیقت کاروبار کی مشکلات کا ادراک اسے خوب تھا سو دو سال تک بخیر و خوبی اپنا کام سنبھالنے کے بعد بڑھانا بھی شروع کر دیا۔ ماں باپ نے بھی بیٹے کا پھلتا کاروبار دیکھ شادی کر دی اور پوتے پوتیوں کو کھلانے کے بعد سکون سے دو اڑھائی ماہ کے وقفے سے پرلوک سدھار گئے۔ ماں

فیصل القدوسی

باپ کی روحوں کو ثواب پہنچانے کے بعد اس نے خود بھی ثواب کمانے کی نیت سے چھوٹے بھائی کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ آٹھ دس مہینے تو خیر رہی لیکن اس کے حساب کتاب دیکھنے پر معلوم ہوا کہ چھوٹا بھائی نہ صرف چھوٹا ہے بلکہ خاصا بھولا بھی ہے۔ کاروبار نہ جاننے کی وجہ سے ہزاروں نہیں لاکھوں روپے بڑے بھائی کے سر چڑھا بیٹھا تھا وہ بھی ان کے جو حلق میں ہاتھ ڈال کر اپنا زیرے کا دانہ بھی نکال لیتے ہیں سو چند ماہ کے انتظار کے بعد انہوں نے اپنے پیسے ٹیڑھی انگلی سے نکال لیے۔ اب پیچھے کاروبار بچا ہی کیا تھا جسے وہ چلاتا، تمام فیکٹریاں واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے اپنی ڈیلرشپ ویسے ہی واپس لے چکی تھیں سو اب وہ آفیشل دیوالیہ کہلایا جانے لگا تھا۔ چلتا کاروبار بند اور دیوالیے پن کی فرسٹریشن نے ایک قتل کروا دیا وہ بھی ان کا جو اسے پہلے ہی پیسے وصولنے کے سلسلے میں نیچا دکھا چکے تھے۔ اپنے فائدے میں تو وہ قتل کیا کچھ بھی برداشت کر لیتے لیکن یہاں فائدہ نظر نہ آنے کی صورت میں انہوں نے مقدمہ کر دیا۔ دو تین پیشیاں تو اس نے ادھار پر بھگتا لیں لیکن اب وکیل کوئی درویش یا ولی اللہ تھوڑی تھا جو فی سبیل اللہ گناہ گاروں کو معافی نامے دلواتا سو بددل ہو کر کیس ہی چھوڑ دیا۔ جاتے جاتے فیس نہ ملنے کا غصہ بارہ سال قید کروانے کی صورت میں نکال گیا۔ ہونی تو پھانسی یا عمر قید تھی لیکن اگلے فریق کے دلچسپی نہ لینے کے سبب بارہ سالہ قید پر جان چھوٹ گئی۔

+++++++

جب وہ رات کو سلاخوں سے کمر ٹکا کر زندگی کے سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھتا تو تیئس سال کی عمر میں شروع ہونے والی بارہ سالہ قید کے بعد، اسے ایک سو پینتیس سال کا شکست خوردہ بوڑھا نظر آتا تھا۔ بچپن میں زندگی کی حقیقتوں سے واقفیت اسے خوابوں کی سلاخوں نے نہیں ہونے دی تھی، اور اب وہی خواب اسے سلاخوں کے پار دکھائی دے رہے تھے۔ شاید کہ اس کی قید میں کمی ہو جائے مگر کون جانے کہ مقدر کا ستارہ کتنی بار چمکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

گھڑی ساز کی اونگھ [مائیکرو فکشن]

عمار نعیمی

وہ ایک ماہر گھڑی ساز تھا؛ وہ پہلے چھوٹی موٹی گھڑیاں بنا چکا تھا لیکن اب کی بار اس نے کچھ منفرد گھڑی بنانے کی سوچی اور ایک گھڑی بنائی جس میں 24 ہندسے درج کر دیے اور گھڑی کی تین سوئیاں بنائیں جن میں ایک سب سے بڑی سوئی تھی اور اس کی لمبائی بمشکل 145 ڈگری تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی لمبائی 206 ڈگری تک پہنچ گئی اور منجھلی سوئی کو مختلف رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ ان رنگوں میں سرخ، سفید، سیاہ، گندمی اور ہلکا پیلا رنگ شامل تھا۔ تیسری سوئی ان دونوں سوئیوں سے بڑی بنانے کا سوچا گیا تھا اور یہ بھی سوچا گیا تھا کہ اسے نہ ہی بنایا جائے لیکن اس سوئی کو بنانے کا سب سے بڑا مقصد ان 24 ہندسوں کی دیکھ بھال کرنا اور ان پر نظر رکھنا تھا لہٰذا دیکھ بھال کرنے کے سلسلے میں اس تیسری سوئی کے حوالے ہتھوڑا، کیل، پینٹ کے ڈبے، خام لوہا اور بہت ساری کھانے پینے کی اشیاء حوالے کر دی گئیں۔ گھڑی ساز نے گھڑی میں

موت کا ایک علامتی جلاد داخل کر دیا تھا جس کا کام یہ تھا کہ وہ اُس تیسری سوئی پر نظر رکھے کہ آیا وہ ان 24 ہندسوں کا خیال بھی رکھ رہی ہے یا نہیں۔

مجموعی طور پر گھڑی کے دو رنگ تھے: سفید اور سیاہ اور گھڑی میں خودکار آلہ نصب کر دیا گیا تھا جس سے کبھی یہ گرم ہو جایا کرتی اور ضرورت کے تحت مختصر مدت کے لیے سرد ہو جاتی۔ گھڑی ساز اپنے کام سے بے حد مطمئن تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس نے ایک شاہکار چیز بنا دی ہے اور یہ گھڑی بنانے میں اسے یاد نہیں کتنے دن لگے تھے کیونکہ اس کی ڈائری میں ایک جگہ سات دن اور ایک جگہ آٹھ دن لکھا ہوا ملتا ہے اور مزید یہ کہ وہ گھڑی بنانے کے بعد سو گیا تھا جس کا وہ اعتراف کرنے سے کتراتا ہے۔

جب تیسری سوئی گھومتی ہوئی 24 ہندسوں سے گزرا کرتی تو ہر ہندسہ اس سوئی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا اور جو سامان تیسری گھڑی کو عطا کیا تھا وہ اس کی جیبوں سے گرتا رہتا اور یوں وہ ہندسے مال پا کر شکر ادا کرتے اور جلاد کو دیکھ کر عبرت پکڑتے اور سمجھتے کہ اس سوئی نے بہت سا مال ایک ساتھ اکٹھا کر لیا تھا اور اپنی دیگر دو بہنوں (سوئیوں) کو اس سے محروم رکھا تھا سو یہ اس کی سزا بھگت رہی ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

گھڑی ساز کے سونے کے بعد سب سے بڑی سوئی نے تیسری سوئی سے سارا سامان لوٹا اور جلاد کو بھی خریدا اور تیسری سوئی کو خدمت پر مامور کیا۔ یہ سب دیکھ کر دوسری سوئی کے رنگ بدلے اور پوری سوئی پر سرخ رنگ چھا گیا۔ تیسری سوئی ازل سے آج تک گھوم رہی ہے اور روزانہ دعائیں کرتی ہے کہ گھڑی ساز جاگ جائے اور اس ظلم پر مجرموں کو سزا دے یا پھر اس جلاد کو ہی عقل آ جائے لیکن افسوس کہ جلاد اپنا مقصد بھول گیا۔ پہلے وہ یہی کام گھڑی ساز کی رضا کے لیے کیا کرتا تھا لیکن اب یہی کام وہ مال کی خاطر بڑی سوئی کے لیے کرتا ہے۔ جب سے یہ ظلم جاری ہے تب سے ہی تیسری سوئی ان 24 ہندسوں کو دہائی دے رہی ہے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کے لیے کہہ رہی ہے لیکن وہ یہ دعا کر دیتے ہیں کہ گھڑی ساز جاگ اور اس گھڑی کو فنا کر دے۔

☆☆☆☆☆

پھر ایک دن دماغ سے دُنیا نکال دی

شاعرِ امروز
فضل گیلانی

شاہد ماکلی

فضل گیلانی سے رُوبرُو غزل سننا ایسے ہے، جیسے نظر سے آگ لگانے والی نار سے راگ سننا۔ فضل گیلانی جیسے عمدہ، مست حال اور خالص تخلیق کاروں کا وجود غنیمت ہے کہ اس دور میں رسیلی باتوں، نشیلی آنکھوں اور چمکیلی روحوں والے لوگ خال خال ہی رہ گئے ہیں۔ وہ بڑے حوصلے والے انسان ہیں تلخیٔ ایام کی جن کڑیل کٹھور گھڑیوں میں عام لوگ سُدھ بُدھ کھو بیٹھتے ہیں، ان کی سرمستی کی پہلی جُرعہ کشی وہاں سے آغاز ہوتی ہے۔ جن کی لپیٹ میں عام تخلیق کار کی تخلیق آخری سانسیں لینے لگتی ہے، اُن زہریلے حالات کے حلقوم سے ان کی شاعری اس طرح برآمد ہوتی ہے جیسے سانپ کے منہ سے منکا باہر نکل آتا ہے۔ ان کی شاعری دریائی کنارے پر مہکتے لہلہاتے ہوئے گھنے جنگل کی طرح ہے جس کا گنجان پن اور ہریالی دیکھنے والوں کو اسرار بھری حیرت اور مسرت سے دوچار کرتی ہے۔

اُن کی شاعری پانی میں کھلے ہوئے تازہ کنول کی طرح ہے جس کو دیکھنے والے نفوس، پاکیزگی کے احساس سے معطر ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری گھنگھور گھٹاؤں میں وقفے وقفے سے چمکنے والی بجلیوں کی طرح ہے جو ہمیں اندھیرے جنگلوں میں رستہ سُجھاتی رہتی ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں پر ان کی شاعری اس طرح اپنا نشان چھوڑتی ہے جیسے شکنتلا کی سہیلیاں لتا منڈپ میں اپنے دلکش نقوشِ پا چھوڑ جاتی ہیں۔

فضل گیلانی۔ 3 نومبر 1977ء کو بستی پیر (تونسہ) میں پیدا ہوئے۔ پولیٹیکل سائنس اور اردو میں ماسٹر کیا۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

دیارِ طیبہ میں جھاڑو لگانے والو! بتاؤ
کوئی سبیل، کہ میری بھی نوکری لگ جائے

چھتوں پہ دانے پڑے رہ گئے تھے کوفہ میں
وہاں کے سارے پرندے نجف چلے گئے تھے

ہاتھ پھیلائے آسماں کی طرف
بوسہ درگاہ کے سپرد کیا

کیا عرض کروں، دل سے ہی مجبور ہوں سیّد
ورنہ تجھے پڑنے ہی نہ دوں اپنی بھنک میں

اس لیے بھی مجھے تجھ سے ملنے میں تاخیر ہے
خواب کو جانے والی سڑک زیرِ تعمیر ہے

اتنے پیڑ اک جگہ دیکھ کر سب بہت خوش تو ہیں
پنچھی جھڑنے پہ میرے ہوا کون دلگیر ہے

ہنستی دنیا ملی آنکھ کھلتے ہی روتی ہوئی
یہ مرا خواب تھا اور یہ اس کی تعبیر ہے

میرے دشمن کی تسلی کے لیے کافی ہے
میں نے اک دوست بنایا ہے تمھارے جیسا

ایسی ہموار رہ گزر تھی مری
کہیں سیدھے قدم پڑے ہی نہیں

اس نے پوچھا ہے مجھ سے، کیسے ہو
اب مجھے جھوٹ بولنا ہو گا

کنارے دُور ہوتے جا رہے ہیں
بہاؤ سُست ہوتا جا رہا ہے

کنارے سے لگا کر زندگی کو
میں کشتی میں اکیلا رہ گیا ہوں

تو خود کو خواب سے مانوس مت کر
ہمیں بس دیکھ لے، محسوس مت کر

ہمارے پاس اُس کی مُشکلیں ہیں
اور اُس کے پاس آسانی ہماری

سبھی کی دسترس میں آ رہے ہیں
کوئی دیکھے تو ارزانی ہماری

میں لہروں پر نظر اس واسطے رکھے ہوئے ہوں
اگر منظر کو دیکھوں گا تو دریا چل پڑے گا

عجب ٹھہراؤ تھا جس میں مسافت ہو رہی تھی
روانہ بھی نہیں تھا اور ہجرت ہو رہی تھی

کہیں جاتا نہیں تھا میں، کہیں آتا نہیں تھا
یقیں آتا نہیں تھا، ایسی حالت ہو رہی تھی

نیا اک باغ تھا اور اس کو کاٹا جا رہا تھا
پرندوں کو ابھی پیڑوں کی عادت ہو رہی تھی

یہ آنسو تو نہ تھے جو بہہ رہے تھے ہجرِ گل میں
یہ خوشبو تھی جو آنکھوں سے روایت ہو رہی تھی

فقط اسی لیے دل کو ترے سپرد کیا
کہ اس کو ٹوٹتا دیکھوں میں تیرے ہاتھ سے بھی

بدن سے جس کی تھکن آج تک نہیں اتری
میں اُس سفر پہ روانہ کبھی ہوا ہی نہ تھا

اسی لیے تو مجھے لوٹنا پڑا سید
کہ میرے پاس کوئی اور راستہ ہی نہ تھا

خزاں رسیدہ درختوں میں آ گیا ہوں کہیں
قدم جو رکھوں تو پتوں کا شور اٹھتا ہے

خرابی تیری نظر میں نہیں ہے دل میں ہے
اسی لیے تو تجھے کم دکھائی دیتا ہے

سبھی کی آنکھ نہیں ہوتی دیکھنے والی
کسی کسی کو مرا غم دکھائی دیتا ہے

نہیں کسی کی کلائی مروڑنے کے لیے
ہمارے ہاتھ تو ہیں ہاتھ جوڑنے کے لیے

اک پل میں ایک واقعہ رکھوں گا دھیان میں
اور دوسرے ہی پل میں اسے بھول جاؤں گا

جو حال میں نہیں تھا وہ حالت میں آ گیا
آئینہ ایک بار تو حیرت میں آ گیا

اب خواب میں بھی چلتا نہیں ہوں کسی طرف
ایسا جمود مجھ میں حقیقت میں آ گیا

پھر ایک دن دماغ سے دنیا نکال دی
اس دن سے یار! میں تو سہولت میں آ گیا

میرے معیار کا اندازہ لگا لو اس سے
جس پہ مرتے ہوا سے چھوڑ دیا ہے میں نے

ٹوٹے رشتوں کی بحالی کے لئے آئے ہیں
ہم یہاں خیر سگالی کے لئے آئے ہیں

اک دیے کی لو ہوا سے جا لگی
خامشی ٹکرا گئی آواز سے

بدن کی رمز سمجھ، رُوح کا اشارہ سمجھ
مجھے سمجھ نہ سمجھ، دُکھ مِرا خدا را سمجھ

جو تیرگی میں تجھے کچھ دکھائی دیتا نہیں
سمجھ میں آئے تو اِس کو بھی اک نظارہ سمجھ

نہیں تو وقت ہی سمجھائے گا تجھے اک دن
مَیں چاہتا ہوں، مِری بات کو دُوبارہ سمجھ

اے مری آنکھ کی دہلیز پہ دم توڑتے خواب!
مجھ کو افسوس ترا ہے بھی، نہیں بھی شاید

ایسی منزل پہ لے آیا ہے مرا رقص مجھے
اب کئی سلسلے بھی ساتھ مرے جھومتے ہیں

مجھی کو ہاتھ بڑھانا پڑے گا اب سیّد
وگرنہ پھول نے تو ہاتھ پر نہیں آنا

میں وہاں بھی نہیں، جہاں میں ہوں
تو وہاں بھی ہے، تو جہاں نہیں ہے

اب تو کھل کر ملا کرو ہم سے
اب محبت بھی درمیاں نہیں ہے

☆☆☆☆☆

گہرے المیے سے پھوٹنے والی شگفتہ شاعری

شاعرِ امروز
مقداد احسن

شاہد ماکلی

مقداد احسن اپنی عمر سے بڑا شعر کہتے ہیں۔ کچھ شعر تو انھوں نے ایسے کہہ رکھے ہیں جو انھیں کچھ سال بعد یا کئی سال بعد کہنے تھے۔ وہ آنے والے وقت کے تیور بہت جلد بھانپ لینے والے شاعر ہیں۔ انھیں پڑھتے ہوئے میں پلک سے روح تک بھیگ گیا ہوں۔ مجھے کہیں کہیں وہ اپنے شعری عمل میں اُس میسو سٹار کی طرح لگے ہیں جو جلدی جلدی اپنا ایندھن پھونک دینا چاہتا ہے، کسی سنگولیرٹی تک پہنچنا چاہتا ہے، پھر اپنی تمام قلبی اور قالبی وارداتوں کو اپنے تخلیقی اور حسیاتی تجربے کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔

مقداد احسن کا شعر کسی گہری حُزنیہ رمزیت اور المیاتی اَسرار سے نمود کرتا ہے۔ یہ شعر اپنی پہلی کیفیاتی حالت میں تو اداسی، وحشت، تنہائی، کرب، افسردگی یا حتیٰ کہ کسی نشاطیہ سرشاری میں گندھا ہوا ہو سکتا ہے مگر جب یہ شعر مقداد احسن کے تخلیقی میکانزم سے فلٹر ہو کر اپنی دوسری حالت تک پہنچتا ہے تو تب تک اس پر کسی نہ کسی طرف سے آئرنی، ظرافت، شوخی، ڈارک ہیومر یا ایک تمسخرانہ ادا کی کوٹنگ ہو چکی ہوتی ہے۔ مقداد احسن کے پورے تخلیقی عمل میں یہ واحد ٹریٹمنٹ ہے جو ان کے شعر کو قابلِ قبول بناتی ہے، جو ان کے اندر کی تلخی اور حُزن کی شدت کو شیرینی اور شگفتگی میں بدل دیتی ہے۔ نتیجے کے طور پر ایک شدید تیکھے پن اور کاٹ دار لہجے کی شاعری سامنے آتی ہے جو اپنی پہلی ہی قرات یا سماعت میں اپنے قاری یا سامع کو گرفت میں لے لیتی ہے، اسے پلک سے روح تک بھگو دیتی ہے۔ یہ شاعر کی عمر سے بڑی شاعری ہوتی ہے اس لیے شاعر کی باطنیت کو وقت سے پہلے بزرگی اور شاعر کی ظاہریت کو وقت سے پہلے بڑھاپے کی طرف دھکیل دیتی ہے۔

مقداد احسن 20 دسمبر 1995 کو تاندلیانوالہ میں پیدا ہوئے۔ باقاعدہ شاعری کا آغاز 2016 سے کیا۔ ایجوکیشن یونیورسٹی فیصل آباد میں زیرِ تعلیم رہے۔ آج کل لاہور میں مقیم ہیں۔ مقداد احسن کا تعلق ایک معروف علمی و ادبی خانوادے سے ہے۔ وہ "تم اک گورکھ دھندا ہو" جیسی مشہور ترین قوالی کے خالق، نازخیالوی کے نواسے ہیں۔

ذیل میں ان کا شعری انتخاب ملاحظہ فرمائیے:

میں بد دعائیں سمیٹوں گا، تاکہ دنیا میں
کسی کے پاس دعا کے علاوہ کچھ نہ رہے

میں خالی ہاتھ کبھی لوٹتا نہیں مقداد
مجھے خوشی کے علاوہ وہ کیا نہیں دیتا

مجھے خدا سے بہت خوف آتا رہتا تھا
تو پھر کسی نے بتایا، وہ ماں کے جیسا ہے

ہمیں اچھالنے والوں کو کوئی سمجھائے
زمین اپنی کشش سے مکر گئی تو پھر

نئی نئی تھی ہوا، تجربہ ضروری تھا
چراغ میں نے اُسے اس لیے بجھانے دیا

مجھے یہ بات بتائی تھی باپ نے کہ خدا
کسی کو کم تو کسی کو زیادہ ملتا ہے

میری حالت پہ جو ہوا اس کو
وہ ہے دنیا کا بہترین افسوس

کوئی حیران ہی نہیں ہوتا
اتنے بیکار شائقین، افسوس

پہلے کیا کم اداس تھی دنیا
مرنے والو! خدا کا خوف کرو

اب مری نیند میں خلل کیسا
آخری بار سو رہا ہوں میں

اب تو دل کے دروازے پر صبر کی آیت لکھی ہے
اس سے پہلے اندر کے حالات بتانا پڑتے تھے

آخری وقت ہے بصارت کا
آنکھ دیوار پر بنا دی ہے

پہلی ٹھوکر یہیں سے کھائی تھی
دوسری بار گر کے یاد آیا

اک قیامت پڑی ہے میرے پاس
اس کو برپا نہیں کروں گا میں

اتنی سنجیدگی بھی کیا کرنی
کوئی مر جائے تو ہنسی آئے

ایک عرصہ میں زیرِ آب رہوں
اور ترسوں، ذرا نمی آئے

یہ کتنا واضح اشارہ ہے بخت ڈھلنے کا
میں بھیک دوں تو بھکاری دعا نہیں دیتا

ہم جیسے تو ایسے پھینکے جاتے ہیں
جیسے ناخن کاٹ کے پھینکے جاتے ہیں

ان کے آگے منزل رکھی جاتی ہے
اپنے پاؤں میں رستے پھینکے جاتے ہیں

اک آواز پہ مڑ کر دیکھا جاتا ہے
ایک صدا پر سکّے پھینکے جاتے ہیں

میں اس کو بتاتا تھا پریشانیاں دل کی
وہ مجھ سے یہ کہتی تھی، خدا خیر کرے گا

روتے روتے میں جسے تھام لیا کرتا تھا
اب وہ دیوار مرے ساتھ لپٹ جاتی ہے

ہم سے ٹھکرائے ہوئے لوگ بھلا کیا سمجھیں
قدر کیا شے ہے، محبت کے معانی کیا ہیں

پہلی آواز پہ آتا ہی نہیں ہے اس کو
اور میں ایک ہی آواز لگا سکتا ہوں

اس نے بھی اپنی زلف کو تھوڑا کیا دراز
ہم نے بھی اپنی مونچھ کا تاؤ بڑھا لیا

میں سرسری سی نظر ڈالتا تھا دنیا پر
پھر ایک دن کوئی چہرہ کہیں دکھائی دیا

یہ دل کہیں بھی لگایا نہیں ہے تیرے بعد
کسی کو دودھ میں پانی نہیں ملانے دیا

اندھیرا حد سے بڑھا تو کسی نے وحشت میں
چراغ کھینچ کے مارا ہے رات کے منہ پر

تمہارے ہجر میں رونے کے وقت سے پہلے
ہمارے گاؤں سے دریا نہیں گزرتا تھا

یہ مسکرانا مرا پھول کے لیے تو نہیں
بس اس کو دیکھ کے اک شخص یاد آیا ہے

تمھارے بھیجے ہوئے تازہ پھول کمرے میں
ہر ایک چیز کی بوسیدگی پہ بھاری ہیں

میرے نصیب میں لکھی ہوئی اداسی کو
چمکتے دن میں اچھالیں تو شام ہو جائے

بچا نہ پائیں گے خود کو بڑی خوشی کیلئے
ہم ایسے لوگ اداسی کا رزق ہوتے ہیں

تمھارے در سے نکالے ہوئے یہ کہتے ہیں
جو لُطف ٹھوکریں کھانے میں ہے، کہیں بھی نہیں

میں چیختا ہوں محبت کے ذکر پر مقداد
کسی کی موت پر آنسو نہیں نکلتے ہیں

فصیلِ حفظ و اماں گر چکی مگر مقداد
ہمارا خضر ابھی تک یہاں نہیں پہنچا

بجائے اس کے، اندھیروں میں ایک ساتھ رہیں
چراغ ترکِ تعلق جلا دیا میں نے

پڑا ہوں طاق میں سلگا ہوا بدن لے کر
وہ طاق، جس کو ابھی تک شگاف بولتے ہیں

یہ میری پہلی محبت کا رنج ہے مقداد
جو اپنے چاہنے والوں میں بانٹ دینا ہے

کسی کے پاس مری نیند رہ گئی لیکن
سکون دیتی ہوئی گولیو! تمھاری خیر

ہوس پہن کے اتاری ہے شرم کی چادر
بدن بھی شاملِ حاجاتِ دلبری رکھا

ہمیں خدا پہ بھروسہ نہیں سکھایا گیا
ہمارے ہاتھ دعا کو نہیں اٹھے سائیں

ہمیں وہ لوگ برا جانتے تھے بستی میں
وہ جن کی اپنی جبینوں پہ داغ تھے سائیں

وہ چاک اس کے لیے سانس کا تسلسل تھا
رفو کے ایک ہی بخیے نے جان لی اس کی

میں سانپ بن کے ترے دل پہ بیٹھ جاؤں گا
کسے قبول ہے اُس کا خزانہ چوری ہو

یہ زخم ٹھیک سے گہرا تو کر کے جاتے تم
یہ پھول پوری طرح سے کھلا دیا ہوتا

یقیں کا عکس کسی آئنے میں باقی نہیں
خدا نہیں تو براہیم کس طرح آئے

یہ کس بدن کی نجاست ہے چار سُو مقداد
زمیں پہ اتنے جراثیم کس طرح آئے

میں اس لیے بھی تمھارے قریب آتا نہیں
پھر اس کے بعد مجھے دُور جانا پڑتا ہے

نیا بنا کے پرانے کو یاد کرتے تھے
جدید ہو کے روایت پہ بات ہوتی تھی

ہمارا ذکر جہنم کا ذکر لگتا تھا
اور ان کے نام سے جنت پہ بات ہوتی تھی

فلک سے پار جہاں کوئی بھی نہیں رہتا
وہاں پہ کوئی گیا تھا کسی سے ملنے کو

میں شرمسار ہوا، جب کسی نے مجھ سے کہا
ترے تو یار بھی تیرے خلاف بولتے ہیں

ضرور لطف کا پہلو ہے میرے جلنے میں
وگرنہ اٹھ کے مجھے وہ بجھا نہیں دیتا

میں تو پاگل بنا رہا تھا تمھیں
اور تم بن گئے ذہین —— افسوس

تیرگی پھیلتی ہی جاتی ہے
اے چراغوں کے وارثین! افسوس

روکتا ہے سکوت دشت مجھے
اور دریا کا شور کھینچتا ہے

بولتا ہوں کہ وہ کہے مجھ سے
تم ذرا چپ رہو گے تھوڑی دیر؟

پھل اتارا ہے جس طرح تو نے
تجھ پہ سایہ نہیں کروں گا میں

میں خدا سے مکالمہ چاہوں
بات کرنے کو آدمی آئے

زندگی وہ جوان لڑکی ہے
جس کی مرضی سے کچھ نہیں ہوتا

پھول درکار ہیں مجھے مقداد
میں نے کچھ تتلیاں بچانی ہیں

☆☆☆☆☆

غزل

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

تو مرا ہوتے ہوئے بھی مجھ سے الگ تھا
فکر کا انداز درمیان رہا ہے

پار کیا خوب آگہی کا سمندر
دامنِ صد چاک بادبان رہا ہے

تیر کی صورت تھا لفظ لفظ ترازو
دِل زدگاں کو سخن کمان رہا ہے

'کون' بتائے ابھی سے 'کون' ہے 'کیا کچھ'
کون زمیں ، کون آسمان رہا ہے

خود مرے اندر چھپا نہ ہو مرا دشمن
مجھ پہ مسلّط عجب گمان رہا ہے

گوہرِ معنی کہاں؟ تُو کس لیے خالد
بحرِ سخن لہر لہر چھان رہا ہے

خالد احمد

غزل

ملے تو گفتگو اُن سے ادھوری رہ گئی ہے
وہ جو اک بات ہے بے حد ضروری رہ گئی ہے

سنانے کو بہت کچھ تھا مگر سُنتا نہیں وہ
ہماری داستاں پوری کی پوری رہ گئی ہے

کبھی دل کے ارادے جھوٹ نکلے خام نکلے
کبھی احباب سے کاوش شعوری رہ گئی ہے

بہت حیران کر دے دید کی یہ ناتمامی
مری آنکھوں میں بس جلوے کی نوری رہ گئی ہے

رقیبوں کی تسلی سے یہ دن بھی کٹ رہے ہیں
مگر قسمت میں اب یاروں کی دوری رہ گئی ہے

سزا کے طور پر چھینا گیا ہم سے اثاثہ
ہمارے پاس لیکن بے قصوری رہ گئی ہے

ہمارے گھر میں جس کے شور سے رونق تھی ثاقبؔ
وہ طوطا اڑ گیا پنجرے میں چوری رہ گئی ہے

آصف ثاقب

غزل

جلیل عالی

تو کیا خود سے مکر نے جا رہے ہو
نشیبوں میں اتر نے جا رہے ہو

بہت بپھری ہوئی ہیں سوچ لہریں
کوئی ہونی بھنور نے جا رہے ہو

سمٹ کر رہ گئے ہو خود میں کتنا
یہ لگتا ہے بکھر نے جا رہے ہو

یہ کن شرطوں رہائی مان بیٹھے
خود اپنے پَر کتر نے جا رہے ہو

اب اس احوال کچھ کہنا ہے مشکل
بگڑنے یا سنور نے جا رہے ہو

تمہیں معلوم ہے تم کس کی خاطر
خود اپنی جیت ہر نے جا رہے ہو

وہاں سے واپسی ممکن نہیں ہے
جہاں کچھ دن ٹھہر نے جا رہے ہو

بس اب رکنا نہیں اپنا مناسب
کہ تم حد سے گزر نے جا رہے ہو

لگے ہو پھول کلیاں ٹانکنے میں
مگر جو بات کرنے جا رہے ہو

غزل

زندگی مجھ پہ اپنا گھر کھول
دستکیں دے رہا ہوں در کھول

آنکھ پر نت نئے مناظر
پاؤں پر نت نئے سفر کھول

جس طرف پھول ہیں صبا ہے
آنکھ اِدھر بند کر اُدھر کھول

کیا ضروری ہے کیا نہیں ہے
کھولنا ہے تو وقت پر کھول

کھول دے مجھ پہ میری دنیا
ابتلاء ہی سہی مگر کھول

سامنے ہے مرے کنارہ
مجھ سے لپٹے ہوئے بھنور کھول

دیکھنا ہے جہانِ تازہ
اے مرے خوف میرے پر کھول

کھل چکی کائنات ساری
اب مری چشمِ خودنگر کھول

شام کیا ہے کنورؔ سحر کیا
وقت کا مطمحِ نظر کھول

اعجاز کنور راجہ

غزل

حسن عسکری کاظمی

تو کوزہ گر ہے بھلے چاک سے اتار مجھے
مگر یہ شرط ہے پہلے ذرا سنوار مجھے

گزر گیا ہے جو اک موجۂ ہوا کی طرح
جدا نہ ہوتا نہ کرتا وہ سوگوار مجھے

بُلا کے در پہ جو اس نے چھپایا چہرے کو
یہی وہ بات ہے گزری جو ناگوار مجھے

کھلے شگوفے مگر پھول بھی نہ بن پائے
اداس کر گیا یہ موسمِ بہار مجھے

مثالِ میر بھلایا نہ عمر بھر اس کو!
کہ اس کی یاد نے رکھا ہے بے قرار مجھے

مجھے خبر ہے کہ جینا محال ٹھہرے گا
کہ مار ڈالے گا آخر فراقِ یار مجھے

وہ ایک شخص جو دل میں سما گیا تھا حسنؔ
اسی کا رہتا ہے ہر لحظہ انتظار مجھے

غزل [نجیب احمد کی نذر]

رات آئی ہے ،سحر کی سوچیں
ہم اجالے کے سفر کی سوچیں

عزم ہی خوف وخطر سے گزرے
وسعتِ حدِ نظر کی سوچیں

روشنی دل میں اترتی جائے
روشِ شمس و قمر کی سوچیں

جس میں حد ہے نہ قرینہ، نہ لحاظ
نارسائی سے حذر کی سوچیں

خوش ادائی پہ بھروسہ کیسا
اس کے اندازِ دگر کی سوچیں

مستقل بادیہ پیمائی کیا
کبھی یکسوئی سے گھر کی سوچیں

بے ثمر پیڑ ہوا ہے کیونکر
کسی شاداب ہنر کی سوچیں

منہدم ہو گی عمارت ساری
پختہ دیوار کی ، در کی سوچیں

حسنِ انساں ہی کو لے ڈوبی ہیں
زہر ہیں تیغ و تبر کی سوچیں

زہر آلود ہوا ہے اسلوب
تنگ ہیں برق وشرر کی سوچیں

لٹ گیا تاج تو نوحہ کیسا
خم نہ کھاتے ہوئے سر کی سوچیں

چھوڑ دیں قصۂ پارینہ کو
آج کی تازہ خبر کی سوچیں

رنگ شعروں کا نکھر جائے ریاضؔ
ہم اگر خون جگر کی سوچیں

سید ریاض حسین زیدی

غزل

ہنستی مسکراتی رہو
بجلیاں گراتی رہو

میرا سینہ حاضر ہے
تیر تم چلاتی رہو

میرے دل کے مندر میں
روز آتی جاتی رہو

شام ساتھ لایا کرو
اور دیے جلاتی رہو

میں کہیں بھٹک نہ جاؤں
راستہ دکھاتی رہو

رات کے اندھیرے میں
چاند بن کے آتی رہو

میرا پیار سچا ہے
مجھ کو آزماتی رہو

میری پیاسی آنکھوں میں
خواب بن کے آتی رہو

زندگی کی راہوں میں
یوں ہی جگمگاتی رہو

شام کے دریچوں میں
آکے بیٹھ جاتی رہو

شعر کی زمینوں کو
آسماں بناتی رہو

بس یہی گزارش ہے
مجھ کو ورغلاتی رہو

مجھ کو اپنی آنکھوں سے
داستاں سناتی رہو

گیت ہوں محبت کا
مجھ کو گنگناتی رہو

تُم مری مسیحا ہو
زندگی بڑھاتی رہو

ننگی خشک شاخوں پر
کونپلیں اُگاتی رہو

خوشبوؤں کی برکھا ہو
خوشبوئیں لٹاتی رہو

چاند کی کرن بن کر
میرے پاس آتی رہو

جمیل یوسف

غزل

یہ جو ویرانیاں مسلّط ہیں
اپنی نادانیاں مسلّط ہیں

سبزگی شہر سے ہوئی رخصت
اب بیابانیاں مسلّط ہیں

دیکھ کر اُس کی کائنات کے رنگ
مجھ پہ حیرانیاں مسلّط ہیں

پارچہ باف ہم، مگر صد حیف
ہم پہ عُریانیاں مسلّط ہیں

اِس ملاوٹ کے دَور میں ہم پر
زہر خورانیاں مسلّط ہیں

بادشاہوں کا بس نہیں چلتا
اُن پہ دربانیاں مسلّط ہیں

ہم سکوں کی تلاش کرتے رہے
اور پریشانیاں مسلّط ہیں

مقتدر لوگ آتے جاتے ہیں
''آنیاں جانیاں'' مسلّط ہیں

لفظ اِبلاغ کر نہیں پاتے
تنگ دامانیاں مسلّط ہیں

جس کسی کی یہاں حکومت ہو
ہم پہ من مانیاں مسلط ہیں

نسیمِ سحر

غزل

اُس وقوعے کی ایک رات کے بعد
آئی پولیس واردات کے بعد

کیا کریں گے سمجھ نہیں آتا
لوگ تسخیرِ کائنات کے بعد

دائمی زندگی قبول نہیں
بے طلب عارضی حیات کے بعد

کوئی رستہ ضرور نکلے گا
اس حدِ دشتِ ممکنات کے بعد

جا رہے ہو تو یہ خیال رہے
شہر آتے ہیں جنگلات کے بعد

صرف وہ شخص ساتھ آئے مرے
جس نے دیکھی ہو گھات گھات کے بعد

غم نہ کر تو خوشی بھی آئے گی
جیسے آتی ہے صبح رات کے بعد

آتے آتے بھی وقت لگتا ہے
ہے زمیں آسمان سات کے بعد

اصل وجہِ گناہ جانے بغیر
سر بھی کیا کاٹنا ہے ہاتھ کے بعد

روندنے میری نیند کو راحتؔ
خواب آئے تگرات کے بعد

راحت سرحدی

غزل

صفدر صدیق رضی

کچھ اور بھی الفاظ و معانی کے علاوہ
لکھنا تو بہت کچھ ہے کہانی کے علاوہ

اس گھر میں بسیرا تھا غریب الوطنی کا
ہم کرتے بھی کیا نقل مکانی کے علاوہ

واپس کیے جاتا ہوں زمانے کو وہی کچھ
مجھ کو جو ملا تلخ بیانی کے علاوہ

تعبیر کی دہلیز پہ اک خواب رکھا ہے
کیا گھر میں ہے اس چیز پُرانی کے علاوہ

اب عشق بھی ہے کشمکشِ رزق پہ موقوف
ہر چیز سبک سر ہے گرانی کے علاوہ

اب شہرِ محبت میں رضؔی اور نہیں کچھ
سیلاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کے علاوہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لے جائیں گی کہاں مجھے تنہائیاں مری
وسعت پذیر ہیں ابھی پہنائیاں مری

غزل

[نذرِ آتش]

اگلے وقتوں کے پرستار لیے پھرتی ہے
روشنی آئینہ بردار لیے پھرتی ہے

سَر پہ اِک تہمتِ رفتہ ہے کہ چھت ہے کوئی
جس کو ٹوٹی ہُوئی دیوار لیے پھرتی ہے

سو گئے منبر و محراب و ستوں اور ہمیں
شہر میں دیدۂ بیدار لیے پھرتی ہے

اُس کو بھی فرصتِ یک گام میسّر نہ ہُوئی
مجھ کو بھی وقت کی رفتار لیے پھرتی ہے

جو سِتارہ ابھی افلاک پہ اُبھرا ہی نہیں
اُس کی خواہش ہمیں بیکار لیے پھرتی ہے

اِتنی مضبوط روایت کا نمائندہ ہُوں
ہر کہانی مِرا کردار لیے پھرتی ہے

کوئی سَر چاہیے شانوں کی بلندی سے ورا
زندگی ہدیۂ دستار لیے پھرتی ہے

خاور اعجاز

غزل

اکثر جو دل میں رہتی تھی خواہش وصال کی
اِک ہجر دے کے اُس نے طبیعت بحال کی

قرقی ہُوئی حیاتِ دو روزہ بہ یک قلم
مہلت جواب کی ، نہ اجازت سوال کی

وہ میرا حال جانتا ہے کچھ کہے بغیر
حاجت نہیں ہے مجھ کو کسی بھی مثال کی

کورا ہمارا نامۂ اعمال ہو گیا
اِک بوند کیا گری عرقِ انفعال کی

کوئی شگفتگی کی خبر ہو تو کچھ کہیں
کیا پوچھتے ہو خاورؔ آشفتہ حال کی

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

اب مجھے راستہ بدلنے دے
اپنے پاؤں پہ مجھ کو چلنے دے

ہم سفر! اِن پرانے رستوں سے
اک نیا راستہ نکلنے دے

تیرے ہمراہ چل رہا ہوں، مگر
رُک ! ذرا دیر کو سنبھلنے دے

ہم غلط فہمیوں کی زد میں ہیں
ٹھیر جا ، یہ عذاب ٹلنے دے

چاند سویا پڑا ہے گہری نیند
آج سورج کو آنکھ ملنے دے

بھول جاتے ہیں کتنی جلدی لوگ
یادِ رفتہ دلوں میں پلنے دے

کوئی آئے نہ آئے جانِ انیس!
رات بھر اک چراغ جلنے دے

محمد انیس انصاری

غزل

حسن والے ملال دیتے ہیں
دردِ دل لازوال دیتے ہیں

جامِ جم دل کا لیں تو بدلے میں
غم کا جامِ سفال دیتے ہیں

اپنے شیدا کے ڈگمگانے پر
وعدہ کر کے سنبھال دیتے ہیں

چند لمحوں کی بخش کر قربت
ہجر کے ماہ و سال دیتے ہیں

وصل کی جب بھی بات ہوتی ہے
مسکراتے ہیں، ٹال دیتے ہیں

بچنا لازم ہے دوستوں سے بھی
پل میں پگڑی اچھال دیتے ہیں

اک نظر میں ہی مرشدِ کامل
بے ہنر کو کمال دیتے ہیں

چشمِ بینا جنھیں میسر ہو
وہ تو باطن اُجال دیتے ہیں

پھول کی پنکھڑی کو اہلِ دل
اُن لبوں کی مثال دیتے ہیں

کوئی صورت حسیں نہیں ہوتی
کُن ہی حسن و جمال دیتے ہیں

وہ بھی فنکار ہیں جو انساں کو
اپنے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں

دل نشیں شعر، حسنِ جاناں کو
نت نئے خد و خال دیتے ہیں

پوجنے والے پتھروں کو بھی
دیوتاؤں میں ڈھال دیتے ہیں

آفریںؔ! اُن کے حسن کے جلوے
دل کو ارفع خیال دیتے ہیں

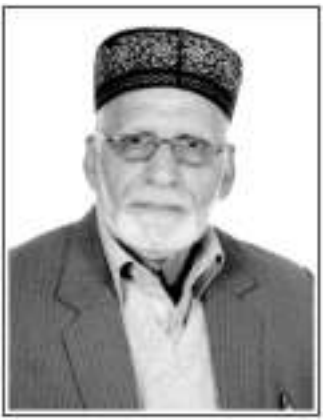

رشید آفریں

غزل

ہماری بدنصیبی ہے بشر ہو کر بشر ڈھونڈیں
ہجومِ بے بصر میں چار سو اہلِ نظر ڈھونڈیں

ہوئے ہیں اس طرح گمرہ مسلماں اَب زمانے میں
سکون و عافیت کو چھوڑ کر سب مال و زر ڈھونڈیں

جہاں کی بے نیازی دیکھ کر دل نے کہا مجھ سے
نہیں میں اُن سے جو اپنی وفاؤں کا ثمر ڈھونڈیں

ہوا ہوں رہ گزر پر قتل میں حالات کے ہاتھوں
مگر منصف مرے ہی عہد کے تیغ و تبر ڈھونڈیں

نہ دولت کا پجاری ہو نہ ہو شہرت کا وہ رسیا
چلو آؤ کوئی ایسا ہی مل کر راہبر ڈھونڈیں

نہ دہشت گرد کا خطرہ نہ ہو خودکش دھماکے کا
اگر کچھ ڈھونڈنا چاہیں تو پھر ایسا نگر ڈھونڈیں

بھلا اندھی اندھیری راہوں میں ہم خاک کیوں چھانیں
اُجالے کے جو ضامن ہوں وہی شمس و قمر ڈھونڈیں

ضروری ہے درِ اقدسؐ پہ ہم سب آفریںؔ جا کر
خلوص و عاجزی کی ہم دعاؤں میں اثر ڈھونڈیں

رشید آفرین

غزل

ہر اک لمحہ پرانا ہو گیا ہے
زمانے کو زمانہ ہو گیا ہے

مٹی جاتی ہے ہر تصویر دل سے
یہاں سب کچھ فسانہ ہو گیا ہے

ہدف اس کا نہیں ہے اور کوئی
مرا دل ہی نشانہ ہو گیا ہے

یہاں جو کارواں ٹھہرا ہوا تھا
سرابوں کو روانہ ہو گیا ہے

چلو کچھ دن جدائی میں گزاریں
بہت ملنا ملانا ہو گیا ہے

میں اپنے گاؤں کی جانب چلا ہوں
وہاں موسم سہانا ہو گیا ہے

کھلے ہیں بال و پر لیکن پرندہ
رہینِ آب و دانہ ہو گیا ہے

دیارِ غیر میں ہیں محل اپنے
یہاں خالی خزانہ ہو گیا ہے

جہاں پہلے کبھی جاتے نہیں تھے
وہیں اب آنا جانا ہو گیا ہے

بہت گدلا گیا ہے اس کا پانی
سمندر بھی پرانا ہو گیا ہے

کسی دن مل بھی جائے گا وہ باقیؔ
تعارف غائبانہ ہو گیا ہے

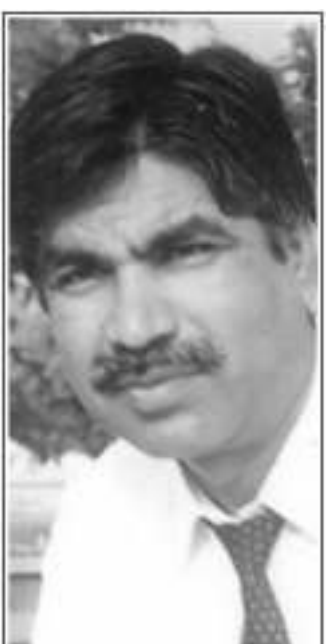

باقی احمد پوری

غزل

محبت بار ہوتی جا رہی ہے
یہ دنیادار ہوتی جا رہی ہے

جو رہ ہموار ہوتی جا رہی ہے
وہی دشوار ہوتی جا رہی ہے

اڑانے آ گئی ہے راکھ میری
ہوا غمخوار ہوتی جا رہی ہے

یہ خوشبو ہے ہوا کی ایک صورت
کلی بیدار ہوتی جا رہی ہے

کسی صورت نہیں جو دسترس میں
مرا معیار ہوتی جا رہی ہے

اُسی کو زندگی کہتے ہیں یارا
جو گل سے خار ہوتی جا رہی ہے

گناہوں سے طبیعت سعدؔ اب کے
بہت بے زار ہوتی جا رہی ہے

سعد اللہ شاہ

غزل

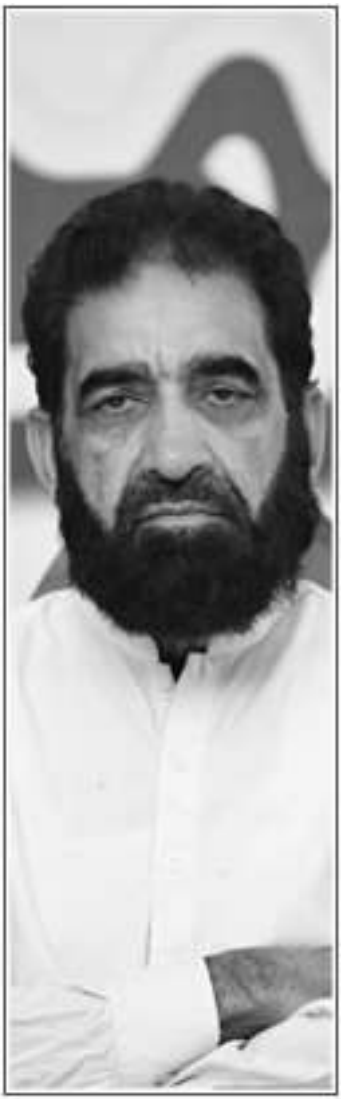

بجھتا ہوا چراغ بجھانے نہیں دیا
تھوڑا سا آسرا بھی ہوا نے نہیں دیا

کیسے انا کے دوش پہ لاکر بٹھا دیا
یاروں نے ہم کو یار منانے نہیں دیا

اک رسم رہ گئی تھی یہ ملنا ملانا بھی
یہ بار بھی دبا نے اُٹھانے نہیں دیا

آنسو پلٹ کے آگئے چھوکر ہمارا دل
پتھر نے پانیوں کو سمانے نہیں دیا

لمحات سے جڑے ہوئے لمحات جاگ اُٹھے
یادوں نے کوئی قرض چکانے نہیں دیا

خوش رنگ تھی زمین مگر سنگلاخ تھی
ہم کو ہنر نے مصرع اُٹھانے نہیں دیا

اے سعدؔ ہم کو لاکھ تردد کے باوجود
دنیا نے ایک بیج پہ آنے نہیں دیا

سعد اللہ شاہ

غزل

اِن آندھیوں کا رزق گھٹایا نہیں گیا
ہم سے سخن چراغ بجھایا نہیں گیا

جس نے کہا تھا ساتھ گزاریں گے زندگی
پھر اس سے لوٹ کر کبھی آیا نہیں گیا

لفظوں میں تیری بات اُتاری نہیں گئی
کاغذ پہ تیرا عکس بنایا نہیں گیا

کانٹوں میں تتلیوں کو پرو کر بنائیں پھول
گلشن کو ہم سے ایسے سجایا نہیں گیا

لکھی نہیں ہے شجرے میں بیعت یزید کی
ظالم سے ہاتھ ہم سے ملایا نہیں گیا

اپنے کبوتروں کی مجھے جاں عزیز تھی
کوفے کی سمت اُن کو اُڑایا نہیں گیا

جب روشنی میں لوگ ہی خیمہ بدل گئے
جلتا چراغ ہم سے بجھایا نہیں گیا

جس دن سے اپنی رات کی رانی جدا ہوئی
کیاری میں دل کی پھول اُگایا نہیں گیا

ہم کو بہت پسند تھے چڑیوں کے چہچہے
آنگن کا پیڑ ہم سے کٹایا نہیں گیا

اشکوں کی جلترنگ تھی آنکھوں کے آس پاس
برکھا سے کوئی گیت سنایا نہیں گیا

جلنے لگے ہیں جب سے وہاں جگنوؤں کے دیپ
ندی میں چاند سے بھی نہایا نہیں گیا

بچوں کا عزم دیکھ کے اس دور میں عقیلؔ
خود ڈر گئے ہیں ان کو ڈرایا نہیں گیا

عقیل رحمانی

غزل

یہ مت پوچھو ہوا ہے کس طرح پر ہو گیا ہے
مبارک ہو تمہیں وہ معرکہ سر ہو گیا ہے

اب اک اک لفظ پڑھ سکتا ہوں آنکھیں بند کر کے
اسے اتنا پڑھا میں نے کہ ازبر ہو گیا ہے

بچھڑ کر تم سے ویرانہ بنا ہے گھر ہمارا
یا ویرانہ جسے کہتے ہیں وہ گھر ہو گیا ہے

ہوئی مدت ابھی تک محوِ حیرت ہے زمانہ
کہ وہ تو چاند تھا کیسے مسخر ہو گیا ہے

پلٹ کر دیکھنے والے کی آنکھوں میں تھا جادو
جسے دیکھا پلٹ کر اس نے پتھر ہو گیا ہے

مقدر سے بھلا پھر کون لڑ سکتا ہے اکرمؔ
بچھڑ جانا اگر اپنا مقدر ہو گیا ہے

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزلیں

ملتے ہیں سبھی حسبِ ضرورت ہم سے
اے کاش! کرے کوئی محبت ہم سے

یک طرفہ محبت تو ہمیشہ کی ہے
اب اور نہیں ہوتی حماقت ہم سے

دعویٰ تو ترا ہونے کا تب ہی کرتے
ہوتا جو ادا حقِ عبادت ہم سے

برسوں سے بھگت ہم تو رہے ہیں اس کو
اِک ہو جو گئی یونہی شرارت ہم سے

اپنا ہی زیاں کرتے رہو گے تم تو
رکھو گے اگر دل میں کدورت ہم سے

ہو جس کے، رہو اُس کے ہمیشہ بن کر
کرتے ہو ضیاؔ تم بھی سیاست ہم سے

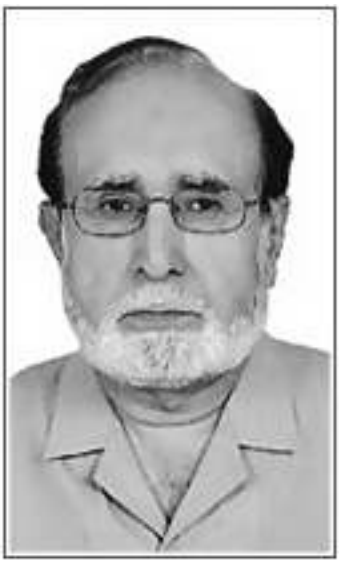

سید ضیا حسین

جھکتا جو نہیں غیر کے آگے کبھی ڈر کے
رہتا ہے سدا زندہ، وہ مرتا نہیں مر کے

دستار کرے آپ ہی جس سر کی تمنا
ہم کیوں نہ پرستار ہوں آخر اُسی سر کے

مولا سے ہیں وابستہ طریقت کے سلاسل
نکلے ہیں بڑے پیر بھی منگتے اسی در کے

در در سے طلب کرنا گوارا نہیں ہم کو
اُٹھیں گے تبھی، دیں گے جو کاسہ ہمیں بھر کے

اس گھر کی تباہی میں نہیں غیر ملوث
دشمن کے مددگار ہیں بھیدی اسی گھر کے

کم ظرف سے نیکی کی توقع نہیں ہم کو
جی بھر کے لگا لیں جو لگا سکتے ہیں چر کے

کس واسطے آرام سے بیٹھے ہیں ضیاؔ جی
الزام چلیں ان پہ ہی دیکھیں کوئی دھر کے

غزل

کراہیں درد کے مارے
سہارے کھو چکے سارے

بہت دُھندلا گئے اب تو
کبھی تھے صاف نظارے

مہِ تاباں ہے یا شعلہ
ستارے ہیں کہ انگارے

وہ اب اغیار جیسے ہیں
وہی جو خود سے تھے پیارے

وہیں کے ہو گئے شاید
جہاں بھیجے تھے ہرکارے

پُرانوں سے ہیں زورآور
نئے سیلاب کے دھارے

سکوں یکسر ہی کھو جائے
کوئی ایسے نہ دل ہارے

ہمیں تڑپاتے رہتے ہیں
ترے وعدے ترے لارے

ہوئے ویران سب قلعے
کبھی بجتے تھے نقارے

بکھرنے کو ہیں اب راشدؔ
شکستہ زیست کے پارے

ممتاز راشد لاہوری

غزل

یعقوب پرواز

سینۂ صد چاک ہے تحفہ ترا
دیدۂ نمناک ہے تحفہ ترا

اے امامِ جبر تیرا شکریہ
نالۂ بے باک ہے تحفہ ترا

تن بدن کا ہوش کس کو عشق میں
یہ پھٹی پوشاک ہے تحفہ ترا

اے گزرتے عصر! تو بھی جان لے
ساعتِ سفاک ہے تحفہ ترا

میں نے دیکھا ہے ستاروں سے پرے
یعنی اوجِ خاک ہے تحفہ ترا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے، سو ترے بعد جی لیے

غزل

زخمِ دل چھپاتے ہیں
روشنی بچاتے ہیں

عکس عکس پگھلا کر
آئنے بناتے ہیں

آنکھ بند کرتے ہی
خواب لوٹ جاتے ہیں

کس کو بھول جانا تھا
یہ بھی بھول جاتے ہیں

ان کی ہی کہانی ہے
ان کو ہی سناتے ہیں

دھوپ سی حویلی میں
سائے سنسناتے ہیں

خود سے جیت کر حامدؔ
خود سے ہار جاتے ہیں

حامد یزدانی

غزل

کہاں چھوٹی کڑی کوئی کہاں اب جا کے جُڑتی ہے
رقم ہوتی کہانی دیکھیے کیا موڑ مڑتی ہے

لگے ٹھوکر نہ جب تک خوئے انساں کب بدلتی ہے
تپے لوہے کی شے بھی چوٹ کھا کر مُڑتی تڑتی ہے

چھلک اُٹھتا ہے درد اشکوں میں یوں جس طرح آنکھوں میں
کوئی پانی سے تر اسفنج کی ٹکڑی نچڑتی ہے

عروجِ رقص میں ہر عضو تھرّاتا ہوا اس کا
کمر کیسی لچکتی ہے! کلائی کیا مڑتی ہے

اڑا پائے کوئی سچ بات کو کیا پَر لگا کر بھی
جو بے پَر کی اڑاؤ دیکھنا پھر کیسے اڑتی ہے

بہت حساس ہوں مرتی ہے جس گھر ماں کوئی روشنؔ
بہت ہلکان جی ہوتا ہے کیا کیا جان کُڑھتی ہے

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لوگ دیوانے ہوئے یا شہر ویرانے ہوئے
کُو بکُو یوں دامنِ صد چاک لہراتے نہ تھے

غزل

مرا ہونا مری تقدیر میں لکھا ہوا تھا
ادھورا خواب پر تعبیر میں لکھا ہوا تھا

محبت میں مرا مل کر تمہارے ساتھ چلنا
عجب ہے ، ہجر کی تحریر میں لکھا ہوا تھا

بنائی تھی کسی نے شوخ رنگوں سے اگرچہ
غمِ دل سارا اس تصویر میں لکھا ہوا تھا

تمہارے پیار کا تعویذ جو باندھا تھا دل پر
وہیں ہے درد جو تاثیر میں لکھا ہوا تھا

ازل سے تا ابد پھیلا ہوا تھا ایک رستہ
سفر بھی حلقۂ زنجیر میں لکھا ہوا تھا

مرا اعزاز محشر میں وہی کلمہ بنا ہے
جہاں میں جو مری تقصیر میں لکھا ہوا تھا

شبہ طراز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رُتوں کے قافلے چلتے رہیں گے
دکھ اپنے وقت پر ڈھلتے رہیں گے

غزل

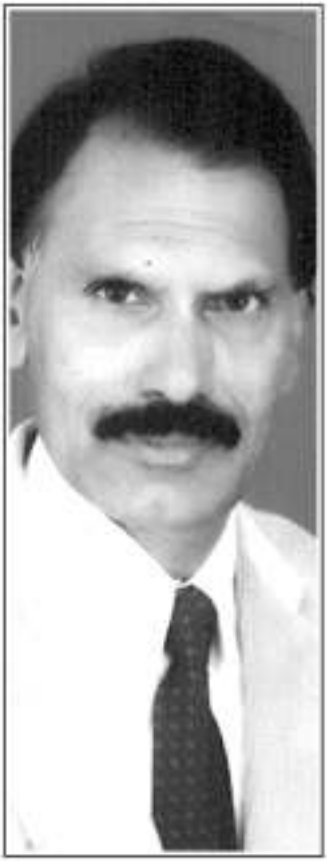

خود سے کوسوں دور ہوا ہوں اندر سے
میں اتنا مجبور ہوا ہوں اندر سے

باہر سے تو سالم و ثابت لگتا ہوں
لیکن چکنا چُور ہوا ہوں اندر سے

میں ہر لحظہ بجھا بجھا تو رہتا ہوں
لیکن جل کر طُور ہوا ہوں اندر سے

سوچتے کیا ہو سولی کوئی سجاؤ بھی
لوگو! میں منصور ہوا ہوں اندر سے

اس انکار میں اک اقرار جھلکتا ہے
میں اس کو منظور ہوا ہوں اندر سے

اپنی موت کا ماتم اپنی جگہ جلیلؔ
لیکن میں مسرور ہوا ہوں اندر سے

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ایک رات کہ مائیں بچھڑنے لگتی ہیں
وہ ایک صبح کہ مانگیں اُجڑنے لگتی ہیں

غزل

تجھ سے کتنا ہے پیار سوچیں گے
تیرے بارے میں یار سوچیں گے

اب ہیں بے اختیار، کیا سوچیں
ہو کے بااختیار ، سوچیں گے

کیا خبر تھی کہ پھول چہروں کی
خار سوچیں ہیں، خار سوچیں گے

جن کے ذہنوں کی سوچ مثبت ہے
وہ خزاں میں بہار سوچیں گے

اب تو خوابوں میں بھی نہیں ملنا
لوگ باتیں ہزار ، سوچیں گے

آگ میں کشتیاں جو چھوڑ آئے
کرکے دریا وہ پار سوچیں گے

ثمینہ سیّد

کھلے ہیں پھول چمن میں بہار کے دن ہیں
مہک رہی ہے بدن میں بہار کے دن ہیں

اب انتظار کی گھڑیاں نہ کٹ سکیں گی حضور
ہے دیر کتنی ملن میں بہار کے دن ہیں

مہک رہی ہے خیالات کی ہر ایک گلی
ہے کیسی باس پون میں بہار کے دن ہیں

اسی لیے تو فضاؤں میں نور پھیلا ہے
یہ لگ رہا ہے گگن میں بہار کے دن ہیں

ثمینہ کوہ و بیاباں میں رنگ اترے ہیں
بچھے ہیں پھول دمن میں بہار کے دن ہے

غزلیں

جہانِ رنگ و بو میں کیوں کسی کی آرزو کرتے
محبت کے علاوہ بھی تو کوئی گفتگو کرتے

تمہارا چہرۂ تاباں، گلوں کے رو برو کرتے
تمھارے حسن کا چرچا، چمن میں چار سو کرتے

تمھارے شہر میں خانہ بدوشوں کی طرح ہم تھے
رقیبوں کو صلائے عام تھی، کارِ عدو کرتے

ودیعت کر دیا تھا جب جنونِ عشق فطرت میں
کہاں تک چاکِ دل، چاکِ گریباں ہم رفو کرتے

تمھاری یاد تھی وجہِ سکونِ قلب، ہجراں میں
تمھاری یاد کو کیوں کر نہ ہم زیبِ گلو کرتے

سنا ہے پھول جھڑتے ہیں، سدا حسنِ تکلم سے
کبھی بھولے سے ہم سے بھی کلامِ دو بدو کرتے

غزل کو ریختہ کا پیرہن دیتے کوئی، شوکتؔ
زبانِ میر کی تقلید، ننگ ہم بھی کبھو کرتے

شوکت محمود شوکت

نہ اب کتابوں میں پھول کوئی، نہ جشنِ فصلِ بہار کوئی
جہانِ دل تو اُجڑ چکا ہے، نہ یار کوئی نہ پیار کوئی

یہاں یہ عنقا محبتیں ہیں، عقیدتیں ہیں، مسرتیں ہیں
یہاں نہیں ہے، عداوتوں کا، حساب کوئی، شمار کوئی

اداسیوں کے گھنے ہیں سائے، جہاں کی رونق نہ راس آئے
کہ لے گیا ہے دلِ حزیں کا، سکون کوئی، قرار کوئی

نہ کوئی مجنوں، نہ کوئی لیلیٰ، رہا نہ اب وہ جنوں کا میلہ
ہوا ہوئے ہیں، وہ دن جو کھوئے، کسی کے غم میں وقار کوئی

وہی زمانے کے سلسلے ہیں، وہی حسینوں کی کج روی ہے
وہی ہے رنگِ چمن ولیکن، نہیں گلوں پہ نکھار کوئی

کسی سے کوئی ملے تو کیسے؟ کرے کسی سے گلے تو کیسے؟
گلے میں پہنا گیا ہے ایسے، عذابِ ہجراں کا ہار کوئی

وہ جس کو کہتے ہیں زندگانی، کوئی سمندر ہے درد و غم کا
وہ جس کو کہتے ہیں قلبِ شوکتؔ، ہے حسرتوں کا مزار کوئی

غزلیں

لوٹ کر اپنے گھر گیا درویش
کون کہتا ہے مر گیا درویش

میں اُسی ذات کا تسلسل ہوں
میرے اندر اُتر گیا درویش

منزلیں چھو رہی تھیں قدموں کو
راستوں سے گزر گیا درویش

شب کدوں کو اُجال کر آخر
روشنی میں اُتر گیا درویش

اس کی ساری دعائیں کام آئیں
دے کے ہم کو سحر گیا درویش

اُس کے جانے سے اب اداسی ہے
اشک آنکھوں میں بھر گیا درویش

محمد نوید مرزا

حُسن پیکر اُداس رہتا ہے
خود سے مل کر اُداس رہتا ہے
ایک ایسا ہے مجھ میں خالی پن
جیسے بے گھر اُداس رہتا ہے
جو خوشی بانٹتا تھا لوگوں میں
اب وہ اکثر اُداس رہتا ہے
پُرمسرّت مکالمے ہیں بہت
کوئی اندر اُداس رہتا ہے
حرف کو آبرو نہیں ملتی
ہر سخنور اُداس رہتا ہے

لہر سے کچھ پتہ نہیں چلتا
کیوں سمندر اُداس رہتا ہے
بھول بیٹھا ہے مسکرانا کیا!
کیوں گلِ سر اُداس رہتا ہے
مجھ سے تنہائی پوچھتی ہے نوید
کیوں تو اکثر اُداس رہتا ہے

غزل

جس دن ترے چہرے کی زیارت نہیں ہوتی
اُس دن مری آنکھوں کی عبادت نہیں ہوتی

فرسودہ رسومات سے لڑتا ہوں بہرگام
خطروں سے جو ڈر جائے محبت نہیں ہوتی

خیرات کی تشہیر ہے تحقیرِ غریباں
شہرت کی تمنا میں سخاوت نہیں ہوتی

سمجھا ہے نہ سمجھے گا ریاکار زمانہ
رشوت کے مصلّے پہ عبادت نہیں ہوتی

آنکھوں سے چھلک جاتے ہیں خاموش فسانے
جب درد کی حرفوں سے وضاحت نہیں ہوتی

اشکوں سے کہو ضبط کے محور سے نہ نکلیں
دستورِ محبت میں شکایت نہیں ہوتی

غیروں کے لیے اشک بہائے نہیں جاتے
مجھ سے تو امانت میں خیانت نہیں ہوتی

دل کھول کے غم دے مجھے رزّاقِ زمانہ
کم رزق سے اس دل کی کفالت نہیں ہوتی

اغراض سکھاتی ہیں عداوت کے قرینے
انسان کی فطرت میں عداوت نہیں ہوتی

یہ دل ہے سحرؔ شاہرہِ عام نہیں ہے
ہر شخص کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی

اکرم سحر فارانی

غزلیں

دل بہت مضطرب ہے رونے کو
اشک ہیں روح میں سمونے کو

بیج غم کے سنبھال رکھے ہیں
درد کے موسموں میں بونے کو

خواب کی سلطنت دکھا دے گا
جسم اک چاہیے بچھونے کو

سب اثاثے لٹا کے بیٹھا ہوں
اب بچا ہے وقار کھونے کو

میں اگر ہوں مجھے نہیں جانو
اب کہاں رہ گیا ہوں ہونے کو

آؤ بیٹھو یہاں ، اجی چھوڑو
کام کو کاڑھنے پرونے کو

عابدیؔ اور اب رہا کیا ہے
زندگانی خراب ہونے کو

علی حسین عابدی

روح کو جسم سے انجان نہ ہونے دینا
دل کی بستی کبھی ویران نہ ہونے دینا

خوب تحقیق سے کہنا غمِ ہستی پہ غزل
اپنے اشعار کو بے جان نہ ہونے دینا

وحدتِ عشق بھی ہے وحدتِ خالق کی مثال
عشق میں شرک کا امکان نہ ہونے دینا

ایک نسخہ یہ ولایت کا سنا تھا میں نے
اپنے لوگوں کو پریشان نہ ہونے دینا

ذات میں کشف و کرامات سمو لو لیکن
دیکھنے والوں کو حیران نہ ہونے دینا

عابدیؔ دہر میں رہنا تو مسافر کی طرح
مستقل ربط کا سامان نہ ہونے دینا

غزل

یوں میری دسترس میں وہ پیکر نہیں رہا
شاید میں اُس کی ذات کا محور نہیں رہا

اس سوچ میں پڑا ہوں میں ساحل پہ بیٹھ کر
جس میں سکوت تھا وہ سمندر نہیں رہا

تعبیر پھر اُلجھ گئی ہے جستجو کے ساتھ
خوابوں کا سلسلہ بھی برابر نہیں رہا

یوں میکدے سے لوٹ گئے ہم یہ دیکھ کر
ساقی نہیں رہا ہے تو ساغر نہیں رہا

ہم پھر انا کی جنگ میں یوں سرخرو ہوئے
دستار بچ گئی ہے مگر سر نہیں رہا

اک ناتمام دکھ ہی مقدر میں لکھ دیا
تقدیر میں ہماری تو محشر نہیں رہا

پھر یوں ہوا کہ ہم کو خزاؤں نے آلیا
پھر دل نشیں بہار کا منظر نہیں رہا

طلعت شبیر

غزلیں

اس بار اس کے ہجر کا شکوہ نہیں کیا
اس بار اُس کا وصل ہی اچھا نہیں لگا
اس بار میرے شوق کی بانہیں نہیں کھلیں
اس بار خود ہی وہ مرے سینے سے آ لگا
اس بار میل جول میں وارفتگی نہ تھی
اس بار دل کسی سے سنبھالا نہ جا سکا
اس بار انتظار کی سُولی نہیں سجی
اس بار بامِ شام پہ روشن دیا نہ تھا
اس بار میں نے پاؤں کے چھالے نہیں گنے
اس بار وہ بھی دور سے بس دیکھتا رہا
اس بار اُس کی ہار یقینی تھی اس لئے
اس بار ہم سے کھیل ہی کھیلا نہیں گیا
اس بار شام وقت سے پہلے ہی ڈھل گئی
اس بار اس کی زلف کا جادو نہیں چلا
اس بار اس کی آنکھ کے جگنو بھی مر گئے
اس بار میرے خواب کا پنچھی بھی اڑ گیا

افتخار شاہد

فلک پہ جتنے ستارے تھے مر گئے چپ چاپ
وہ میری شب کے سہارے کدھر گئے چپ چاپ

پھر ایک روز، تمنا کے پھول جتنے تھے
بدن کی شاخ سے اترے، بکھر گئے چپ چاپ

اگرچہ ایک تلاطم بپا تھا آنکھوں میں
مگر وہ اشک جو دل میں اتر گئے چپ چاپ

لبوں سے آج بھی حرفِ دعا نہیں نکلا
بس ایک سجدہ ترے در پہ کر گئے چپ چاپ

تقاضا ہائے محبت یا دید کچھ بھی نہیں
ہم اپنی آنکھ ترے در پہ دھر گئے چپ چاپ

کچھ ایسے لوگ تھے شاہدؔ جو بولتے کم تھے
نظر کے راستے دل میں اتر گئے چپ چاپ

جو اس نے ہنس کے بلایا تو جی اٹھے شاہدؔ
ذرا بگڑ کے جو دیکھا تو مر گئے چپ چاپ

غزل

ہے تو تہمت ہی نیک نامی دراصل
بھا گئی ہے ہمیں یہ خامی دراصل

کِس کو سمجھایئے کہ ہوتی ہے
خود کلامی خدا کلامی دراصل

دل بتائے گا راستہ اُس کا
اِک یہی شخص ہے مقامی دراصل

ہم تک آنا ہی گر نہیں مقصود
ہوتی کیوں ہے یہ خوش خرامی دراصل

بخوشی کھینچی تھی جو ہجر کی سانس
تھی نہ تقریبِ اختتامی دراصل

پانی سے واسطہ نہیں رکھتی
جانے کیا ہے یہ تشنہ کامی دراصل

اِک نظر ڈال جان جائے گا
آپ پیغام ہے پیامی دراصل

ٹھیک سے کرتا ہوں میں کام خراب
بس خطائیں ہے میری خامی دراصل

حسنین سحر

غزل

ہم دشتِ دل کو نقش سے آباد کر سکیں
ملتے رہا کرو کہ تمہیں یاد کر سکیں

خود پر تو ایک عمر سے بس چل نہیں رہا
چڑیاں خرید لاؤ کہ آزاد کر سکیں

اشکوں میں ہے سمائی ہوئی ایک جَل پری
اے کاش اِس پری کو زمیں زاد کر سکیں

کچھ اور زندہ رہنے کی خواہش ہے ٹھیر جا
یہ کام وہ نہیں جو ترے بعد کر سکیں

آغازِ دشتِ ہجر میں کچھ دوست تھے مگر
ممکن نہیں کہ اب مری اِمداد کر سکیں

اِک شخص ہو ہمارا ہو اور اِس طرح سے ہو
آباد کر سکیں جسے برباد کر سکیں

آ جسم و جاں کو خاک کریں، تجربہ سہی
شاید علاج ہجر کا ایجاد کر سکیں

اشفاق ناصر

غزل

جس سے دل زندہ ہے وہ کارِ محبت ہی تو ہے
ہنس کے سہتا ہوں کہ آزارِ محبت ہی تو ہے

میں نے رکھا ہے بہت اُجڑے ہوئے دل کا خیال
کام کی چیز یہ شہکار محبت ہی تو ہے

اس کے سائے میں مجھے بیٹھنا منظور نہیں
گر نہ جائے کہیں دیوارِ محبت ہی تو ہے

تیرے چہرے پہ جو خوشبو سی کھِلی رہتی ہے
اس کے پیچھے مرا گُل زارِ محبت ہی تو ہے

کون رہتا ہے کسی ایک ہی در کا ہو کر
مان لیجے کہ یہ ایثارِ محبت ہی تو ہے

کچھ ترے اور مرے بیچ نہیں اس کے سوا
چل ہٹا دیتے ہیں کہسارِ محبت ہی تو ہے

کچھ بھی مطلوب نہیں تیرے خزانوں سے اسے
طالب سادہ طلب گارِ محبت ہی تو ہے

طالب انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ چاند کسی ڈھب اُترے دل جھیل میں اک شب اُترے
ہر لہر تڑپ اُٹھے گی ہر عکس دہائی دے گا

غزل

ہارون الرشید

کوئی خواہش نہ ارمان رکھا
مختصر اپنا سامان رکھا

یہ زرِ فقر مجھ کو بہت ہے
جیب میں بس یہی دان رکھا

شکر جتنا کروں اُتنا کم ہے
تو نے ہر موڑ آسان رکھا

اے خُدا اُن کو آباد رکھنا
وہ جنھوں نے مرا دھیان رکھا

خود بھی آرام سے رہ نہ پایا
جس نے مجھ کو پریشان رکھا

زندگی جُز فسانے کے کیا ہے
سو فسانہ ہی عنوان رکھا

پھاند کر دل کی دیوار نکلا
وہ جسے اس میں مہمان رکھا

غزل

آ کے دیوار و در میں ٹھہرے تھے
سارے غم میرے گھر میں ٹھہرے تھے

ان سے آگے نکل گیا رستہ
جو مسافر سفر میں ٹھہرے تھے

لوگ پتھر مزاج تھے سارے
شیشہ گر کس نگر میں ٹھہرے تھے

ہم نے سانسوں کا مول رکھا تھا
شہرِ خوف و خطر میں ٹھہرے تھے

رک گئیں وقت کی سبھی نبضیں
ہم تری رہگذر میں ٹھہرے تھے

رنگ شاخوں پہ چھا گیا تھا کمالؔ
جب پرندے شجر میں ٹھہرے تھے

اشرف کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک ، خاشاک ، خار ، خَس خالد
انتظارِ نمو میں رہتے ہیں

غزل

وصل کی اذیت سے خواب کو بچایا کر
ہجر ملنے آئے تو پیار سے بٹھایا کر

اس نے خط میں لکھا ہے، روز شام ہوتے ہی
گاؤں کے درختوں پر گھونسلے بنایا کر

شامِ غم کے خیموں سے جب چراغ بجھتے ہوں
عشق کے مسافر کو راستہ دکھایا کر

پھر کسی کہانی میں، دشت کی منڈیروں پر
دن ڈھلے پرندوں کو لوریاں سنایا کر

داستاں سرائے میں آگ بجھنے والی ہے
آگ کے الاؤ کو داستاں بنایا کر

ریاض شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

موسم نے کھایا ، پلٹا ساون کا
باتوں باتوں میں ، شعلہ سا لپکا

غزل

یہ میری خاک میں کیسا نظارہ اُگ آیا
کہ جس کے اُگتے ہی مجھ میں اشارہ اُگ آیا

یہ مجھ میں تیری نمو داری کی دھنک پھوٹی
کہ زندگی کا نیا استعارہ اُگ آیا!

کلون سازی بالآخر کمال کو پہنچی
ابد کی کیاری میں پیکر تمھارا اُگ آیا

میں بے قراری چھڑکتا تھا آبپاشی کے وقت
مری غزل کی زمینوں سے پارہ اُگ آیا

نہادِ شب میں کہیں چھپکلی کا جین نہ ہو
جو کٹ گیا تھا، وہ حصہ دوبارہ اُگ آیا

کسان قحط میں یکجا ہوئے ہیں سڑکوں پر
کہ چارہ اُگ نہ سکا، بھائی چارہ اُگ آیا

بلا کا جوش نمو ہے ہماری وادی میں
کہ ہر نظارے کے اندر نظارہ اُگ آیا

اچانک ایک افق سے بہار اُبھر آئی
اچانک ایک چمن میں ستارہ اُگ آیا

نشاط، رنجِ گراں سے نمو پزیر ہوئی
یہ کس چٹان سے سبزہ ہمارا اُگ آیا

کہیں سے سیم زدہ بھی ہے رنج کا رقبہ
مگر یہ کھیت تو سارے کا سارا اُگ آیا

خلائے ذات میں منظر اُگے تو یوں کہیے
کہ ہاں! اکیلے دنوں کا سہارا اُگ آیا

نئے سیاق میں ظاہر ہوا افق شب کا
نئے سباق میں دن کا کنارا اُگ آیا

فلک سے پھوٹ پڑیں ریزہ ریزہ تمثیلیں
زمیں سے عکس ترا پارہ پارہ اُگ آیا

مکاں رُتوں کے خطِ استوا پہ ہے شاہدؔ
ہمارے ہر طرف اک رنگ نیارا اُگ آیا

شاہد ماکلی

غزلیں

زرد ہو کر رہ گئی ہے سبز گھاس
خوش بیانی پھر رہی ہے اب اُداس

وقت نے مرہم کو مخفی کر دیا
زخم سب کے سامنے ہیں بے لباس

کیا شکایت ہم خزاؤں سے کریں
''موسمِ گل بھی نہیں آیا ہے راس''

عالمِ فانی ، فنا کا انتظار
کیا خبر کس شکل میں ہو آس پاس

ہم ہیں متلاشی سکوں کے آج کل
اور چاروں سمت ہے خوف و ہراس

اب تو ہیں اقبالؔ سے انجان سب
جو بنے پھرتے تھے یاں چہرہ شناس

اقبال سرو بہ

جو مجھ پر خاص ہے تیری عنایت ہو نہیں سکتی
کسی سے بھی تجھے اتنی محبت ہو نہیں سکتی

منافع پاس رکھتا ہے خسارہ مجھ کو دیتا ہے
کسی بھی طور اب اس سے شراکت ہو نہیں سکتی

یہ مانا پھول سے بھی نرم و نازک لوگ ہوتے ہیں
ہمارے یار جیسی تو نزاکت ہو نہیں سکتی

جہاں کے حکمراں اپنی رعایا کا بھلا چاہیں
کبھی ایسی ریاست میں بغاوت ہو نہیں سکتی

سنا ہے نام محشر کا مگر یہ بھی حقیقت ہے
ہمارے عہد سے بڑھ کر قیامت ہو نہیں سکتی

سبھی اقبالؔ بازاری حد الفت میں آ بیٹھے
محبت کے علاقے میں تجارت ہو نہیں سکتی

غزل

جسم کی دیوار میں رہنے لگا
عشق اب اِس غار میں رہنے لگا

جنگ بھی ابلیس سے جاری رہی
لطف بھی انکار میں رہنے لگا

اڑتے اڑتے پر ہمارے جل گئے
پھر نشہ سا ہار میں رہنے لگا

عشق نے کاسہ اٹھایا چل دیا
بھیڑیا دربار میں رہنے لگا

چیونٹیوں نے کھا لیا سارا بدن
صبر پھر اشجار میں رہنے لگا

جب وہ سورج کو اٹھا کر چل دیا
وقت پھر آثار میں رہنے لگا

سید تحسین گیلانی

غزلیں

پیڑ جب تک ہرا نہیں کرے گا
پھول کوئی کھلا نہیں کرے گا

یار کتنا یقین تھا مجھ کو
کہ تُو مجھ سے دغا نہیں کرے گا

بیوفائی سرشت ہے جس کی
وہ کسی سے وفا نہیں کرے گا

ایک حسرت ہے تجھ کو پانے کی
میرے حق میں دعا نہیں کرے گا؟

گر کسی کی برائی چاہو گے
رب تمہارا بھلا نہیں کرے گا

جھوٹ میں نے پکڑ لیا اُس کا
وہ مرا سامنا نہیں کرے گا

کہہ دیا ہے چراغ نے ارشدؔ
طاقچے میں جلا نہیں کرے گا

ارشد محمود ارشد

دوسری بار عبادت بھی تو ہو سکتی ہے
یار اک اور محبت بھی تو ہو سکتی ہے

اتنے مبہم تو اشارے بھی نہیں تھے اُس کے
ہاں کسی روز وضاحت بھی تو ہو سکتی ہے

آؤ کچھ کام ادھورے ہیں مکمل کر لیں
ختم یہ وقت کی مہلت بھی تو ہو سکتی ہے

میں اسی آس پہ گاؤں کی طرف آیا ہوں
سانس لینے میں سہولت بھی تو ہو سکتی ہے

تیرے چہرے کی سپیدی میں جو لالی آئی
یہ مری آنکھ کی حدت بھی تو ہو سکتی ہے

عین ممکن ہے کہ منزل کے نشاں مل جائیں
کارِ اُلفت میں خجالت بھی تو ہو سکتی ہے

سرخ ہونٹوں سے ذرا ہونٹ ملا لو ارشدؔ
بادہ خواری کی سی لذت بھی تو ہو سکتی ہے

غزل

نام لیا ہے میں نے کب دانائی کا
میں تو پیروکار ہوں اک سودائی کا

حال برا ہے دنیا میں سچائی کا
میں نے گوشہ ڈھونڈ لیا تنہائی کا

تم کرتے ہو باتیں یار لڑائی کی
وقت نہیں ہے میرے پاس لڑائی کا

کب سنتے ہیں آپ کسی بیچارے کی
کب دیتے ہیں موقع آپ صفائی کا

چیز پرائی آخر چیز پرائی ہے
ذکر کرو نہ یارو چیز پرائی کا

کس نے ابنِ مریم کو تڑپایا ہے
کس نے گھر مسمار کیا ماں جائی کا

خود محروم ہے بیچارہ بینائی سے
شاکی ہے جو شخص مری بینائی کا

تم سے بڑھ کر میٹھی کوئی چیز نہیں
کیوں لائے ہو ڈبہ یار مٹھائی کا

مجھ سے پوچھ رہا تھا کوئی رستے میں
کب جائے گا تیرا شوق پڑھائی کا

انصر پوچھتا پھرتا ہوں دیواروں سے
کون ہے مجرم شہروں کی رسوائی کا

انصر حسن

غزل

جس کے سینے میں غم نہیں ہوتا
شخص وہ محترم نہیں ہوتا

میں جو کرتا ضمیر کا سودا
میرا سر بھی قلم نہیں ہوتا

فاصلہ جتنا چاہے بڑھ جائے
رابطہ پھر بھی کم نہیں ہوتا

پیار جلدی مرا نہیں کرتا
"حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"

روگ لگتا نہیں ہے ہر دل کو
ہر کسی کا صنم نہیں ہوتا

غمِ دُنیا ہو یا غمِ دوراں
ایک دوجے میں ضم نہیں ہوتا

بڑھتی جاتی ہے یاد کی گٹھڑی
بوجھ شانوں کا کم نہیں ہوتا

رنج آتے ہیں کیوں پنہ لینے
دِل کوئی آشرم نہیں ہوتا

رفتہ رفتہ بھلایا جاتا ہے
سانحہ ایک دم نہیں ہوتا

میں نے دیکھا ہے حوصلہ اپنا
ورنہ اِتنا بھرم نہیں ہوتا

آنکھ اُٹھا کر وہ دیکھ لیں شہزادؔ
ہم پہ اِتنا کرم نہیں ہوتا

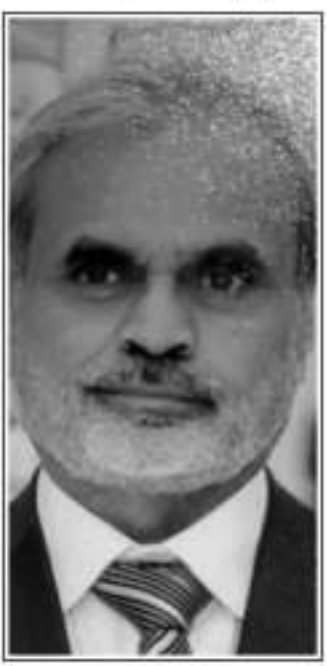

شہزاد احمد شیخ

غزلیں

کھول دے کوئی نظارہ کھول دے
اب مری آنکھوں پہ سپنا کھول دے

کیوں رخِ جاناں رہے زیرِ نقاب
چاند پر بادل کا پہرہ کھول دے

سات رنگوں کی دکھا ہم کو دھنک
رحمتوں کا یہ اشارہ کھول دے

ٹھوکریں تو ہم نے کھائی ہیں بہت
اب کوئی منزل کا رستہ کھول دے

حبس ہے ایسا کہ دم گھٹنے لگا
اے خدا اب ہم پہ پروا کھول دے

بھید کھل پایا نہیں دل کا کبھی
کاش وہ اب چپ کا روزہ کھول دے

اجنبی ہوں شہر میں جاؤں کہاں
آج کی شب اپنا کمرہ کھول دے

دستکیں جبران ہیں دروازے پر
اٹھ کے دروازے کا کنڈا کھول دے

وسیم جبران

کون ہے کس کا طرف دار نہیں سمجھو گے
کتنا دیتے ہیں دغا، یار نہیں سمجھو گے

تم غلامی میں بھی خوش ہو تو بڑے سادہ ہو
تم ہو محکوم کہ سردار نہیں سمجھو گے

سر پہ لٹکی ہوئی تلوار ہے کیا تم سے کہوں
سر سنبھالوں گا کہ دستار نہیں سمجھو گے

جلد بازی میں چلے آئے ہو ننگے پاؤں
عشق ہے وادیٔ پر خار نہیں سمجھو گے

تم کو کیوں مجھ سے پرے کھینچ رہا ہے کوئی
دشمنِ جاں ہے یہ پندار نہیں سمجھو گے

آج بولوں گا نہ میں کوئی صفائی دوں گا
مجھ کو معلوم ہے سرکار نہیں سمجھو گے

غزل

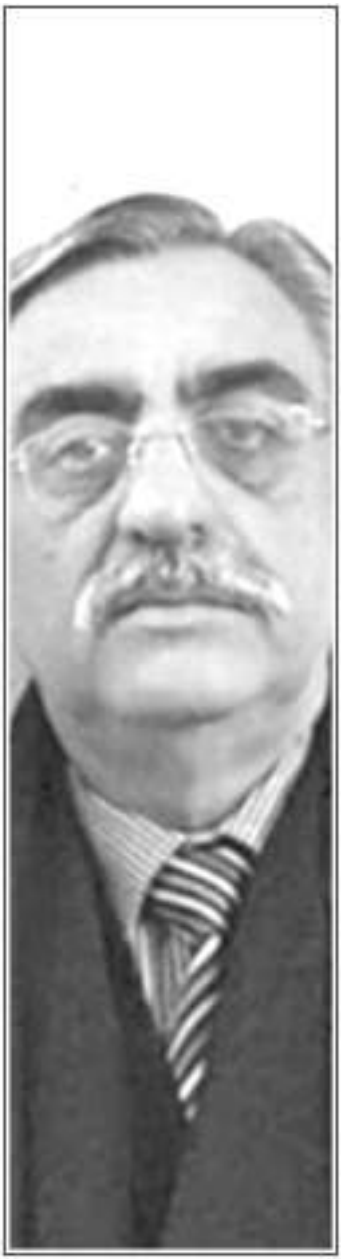

بیتے لمحوں کی صدا یاد ابھی تک ہے مجھے
اُن کی وہ شوخ ادا یاد ابھی تک ہے مجھے

وقت وُہ یاد ہے ملتے تھے جہاں روزانہ
باغ پھولوں سے بھرا یاد ابھی تک ہے مجھے

ناخدا نے تو مجھے دور کیا ساحل سے
اور وُہ فضلِ خدا یاد ابھی تک ہے مجھے

بے رُخی اُس کی نہیں بھول سکے ہم اب تک
کیا مرے ساتھ ہوا یاد ابھی تک ہے مجھے

اُسے تو بھول ہی جانا تھا یقیں ہے مجھ کو
اپنی اُلفت کا صلہ یاد ابھی تک ہے مجھے

یہ الگ بات مُلاقات نہیں ہو پاتی
وُہ جو مانگی تھی دُعا یاد ابھی تک ہے مجھے

ایسی باتیں بھلا کس طرح بھلائیں تاثیرؔ
وہ جو کرتے تھے گِلہ یاد ابھی تک ہے مجھے

تاثیر نقوی

غزلیں

کر ہی ڈالو کرنے والے کام اے یارِ من
سن پاؤ تو سن لو سارے نام اے یارِ من

ایک اکیلا اور دو گیارہ سنتے آئے ہم
ساتھ کسی کے تُو بھی چل دو گام اے یارِ من

اُلفت رستہ چلتے جانا اور نہیں رُکنا
رسوائی ہے عاشق کا انجام اے یارِ من

داؤ پیچ کا کھیل ہے تھوڑی چالیں تُو بھی سیکھ
چال عدو کی کر دینا ناکام اے یارِ من

جی داری فاروقؔ ضروری چھوڑ نہ اپنا جی
دن کڑوا ہے اور ہے میٹھی شام اے یارِ من

زبیر فاروق

زیست سے نکلا اور پھر نکلا وہ میرے گھر سے
مجھ سے پیار وہ کرتا تھا بس اُوپر اُوپر سے

یاد تری نے جب بھی مجھ کو آ کر گھیر لیا
میری آنکھوں سے متواتر اشکِ غم برسے

تو لکھتا جو خط نہیں مجھ کو اُس کا کیا ہے دوش
اُلجھا رہتا ہوں تیرے کیوں میں نامہ بر سے

ایک عجیب سی ہیبت چھائی رہتی ہے ہر دم
آنکھ مری مانوس نہیں ہوتی ہے منظر سے

جس نے میرے پیار کی کوئی قدر نہیں پائی
سچے پیار کو وہ فاروقؔ جی ترسے ہی ترسے

غزل

بشیر احمد حبیب

یا تو مجھ سے ملا نہیں ہوتا
یا کبھی بھی جدا نہیں ہوتا

تو اگر غیر تھا تو تیرا سخن
نغمۂ جاں فزا نہیں ہوتا

تو اگر دیکھتا نہ میری طرف
شجرِ دل ہرا نہیں ہوتا

گہرا ہوتا اگر نہ ذات کا عکس
دھندلا یہ آئنہ نہیں ہوتا

یہ پرستش کا فیض تھا ورنہ
بُت کسی کا خدا نہیں ہوتا

تو نہ جاتا اگر خفا ہو کر
زخمِ جاں لادوا نہیں ہوتا

حرفِ مطلب غزل میں در آتا
آنکھ سے گر ادا نہیں ہوتا

تو نہ کرتا اگر نظر انداز
میں کسی اور کا نہیں ہوتا

غزلیں

سرِ محفل گلے مل کے ریاکاری کریں گے ہم
تجھے اپنا بنانے کی اداکاری کریں گے ہم

کسی سے اب چھپائیں گے نہ ہم قصہ محبت کا
جہاں کے سامنے اب جرم اقراری کریں گے ہم

زمانے کے لیے تیری پھڑک دیکھی نہیں جاتی
دلِ ناداں! تجھے جذبات سے عاری کریں گے ہم

ارے آنکھیں کیا تیرا ہمیں دل بھی پکارے گا
کہ تجھ پر عشق یہ اک روز یوں طاری کریں گے ہم

اگرچہ زندگی پر اک کسک کی چھاپ ہے لیکن
تمہاری آرزو میں زندگی ساری کریں گے ہم

خدا پر چھوڑ دیں گے فیصلہ تیری جفا کا یوں
صدا دیں گے تجھے ناحد کوئی جاری کریں گے ہم

سنا ہے ملک دشمن کو یہاں دستار ملتی ہے
وزارت کے لیے ہر بار غداری کریں گے ہم

محلوں کے در و دیوار سے سر پھوڑنے والو
تمہارے واسطے گھر میں شجر کاری کریں گے ہم

بدلنا حرف سے ثاقب نہیں کچھ بھی رہا ممکن
زمانہ ساز بن کے اب اداکاری کریں گے ہم

ثاقب تبسم ثاقب

فضائے حبس میں آخر ہوا تازہ چلی اک دم
پرندوں نے رہائی کی دلوں میں ٹھان لی اک دم

مَیں چھوڑوں گا نہیں اے غم ترا دامن کسی صورت
گزاری ہی نہیں جاتی ترے بن اک گھڑی اک دم

یقیناً اب شکستِ فاش دوں گا سب اندھیروں کو
یقیناً اب گلے سے آ لگے گی روشنی اک دم

مَیں آیا تھا یہاں پر اُلفتوں کو بانٹنے لیکن
یہ بستی بھی مجھے کردار کی سُوفہ لگی اک دم

یہ کیسی ساحری سی چھا رہی ہے بصیرت پر
جو قسمت میں نہیں ہے اب دکھائی دے وہی اک دم

کسی صورت مَیں ثاقب اب خزانوں کا نہیں طالب
خدایا! اب اِدھر کر اک نظر بس آخری اک دم

غزل

جبیں تو خاک پر رکھی ہوئی ہے
نظر افلاک پر رکھی ہوئی ہے

زمانے سے جدا ہم نے جنوں کی
بنا ادراک پر رکھی ہوئی ہے

بنا بھی دے کوئی صورت الٰہی
تمنا چاک پر رکھی ہوئی ہے

زبانوں پر تو ہے تسبیح لیکن
نگہ املاک پر رکھی ہوئی ہے

تسلی کے لیے پتھر کی سل بھی
دلِ صد چاک پر رکھی ہوئی ہے

ہمارے جسم ساکت ہو چکے ہیں
حیاتی طاق پر رکھی ہوئی ہے

سمے ہی تھم گیا ہے یا پھر ارشدؔ
گھڑی چقماق پر رکھی ہوئی ہے

ارشد شاہین

غزلیں

پیار سا دوسرا مشروب نہیں ہونے کا
کس سیہ بخت کو مرغوب نہیں ہونے کا

حسنِ ہر ذرہ یہاں دامنِ دل کھینچتا ہے
آدمی اپنا ہی محبوب نہیں ہونے کا

دھیمے لہجے پہ کوئی کان دھرے یا نہ دھرے
شور انگیزی تو اسلوب نہیں ہونے کا

لاجواب اپنے دلائل سے مجھے کر ڈالیں
میں چکا چوند سے مرعوب نہیں ہونے کا

گھن گھرج سے نہیں سہمیں گے سوالات کبھی
اتنی آسانی سے مغلوب نہیں ہونے کا

کون منزل سے مجھے دور رکھے گا جاذبؔ
جب ارادہ مرا مصلوب نہیں ہونے کا

اکرم جاذب

ہر شے زمینی اور زمانی بدل گئی
کردار تو وہی ہیں کہانی بدل گئی

اک اپسرا تھی صورت و سیرت میں بے مثال
پی کر تمہارے شہر کا پانی ، بدل گئی

لاتی نہیں اڑا کے مہک اب ہوائیں یا
موسم کے ساتھ رات کی رانی بدل گئی؟

بدلا ہے اپنا اس نے رویہ کچھ اس طرح
جیسے کسی ندی کی روانی بدل گئی

اب بھی اٹھائے پھرتا ہوں کاندھے پہ گھر مگر
صد شکر خوئے اشک فشانی بدل گئی

تبدیل جیسے کر لیے معنی لغات نے
ہر چیز ہو نئی کہ پرانی بدل گئی

غزل

روشنی ہے شبابِ آئینہ
تیرگی ہے نقابِ آئینہ

ہم نے دیکھا نہیں پسِ منظر
زندگی ہے کتابِ آئینہ

تیری صورت ہمیں نظر آئی
جب بھی الٹی نقابِ آئینہ

جھوٹ دھوکہ یہاں نہیں چلتا
ہے محبت نصابِ آئینہ

روبرو جب ہوا وہ شوخ نظر
ہو گیا انتخابِ آئینہ

پھول خوشبو صبا پہ رعنائی
ہے حقیقت میں خوابِ آئینہ

جن کا باطن حکیمؔ میلا تھا
وہ نہ سمجھے خطابِ آئینہ

حکیم خان حکیم

غزل

اپنے آثار سے نکل آیا
راستہ غار سے نکل آیا

آدمی نے بڑی ترقی کی
کتنے ادوار سے نکل آیا

اس کو اپنی گلی میں دیکھا تھا
خود میں دیوار سے نکل آیا

قیس گزرا تھا ایک جنگل سے
خون اشجار سے نکل آیا

میں پکارا تھا یا علی مولا
پھر میں آزار سے نکل آیا

دن کا مزدور محنتی سورج
شب کے اسرار سے نکل آیا

میں نے ساجدؔ یہی بغاوت کی
مستقل پیار سے نکل آیا

ساجد رضا خان

غزل

سر پہ سورج بھی میسر نہیں ہونے والا
سایہ بھی قد کے برابر نہیں ہونے والا

میں نے اک بار ترے غم کو دکھائیں آنکھیں
اب مرا عشق قلندر نہیں ہونے والا

ٹھیک سے دل پہ حکومت بھی نہیں ہو سکتی
تو کسی طور سکندر نہیں ہونے والا

میں نے پتھر پہ لکھے فیصلے خود ہی بدلے
اوج پر تیرا مقدر نہیں ہونے والا

اپنے دریا کو کہیں اور اتارو جا کر
یہ مرا دل تو سمندر نہیں ہونے والا

شوق سے جائے اگر جانا ہے اس نے رفعتؔ
دل کی دیوار میں اب در نہیں ہونے والا

رفعت وحید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ایک ضرب اور اے حواس شکن
آج رگ رگ خمار سا ، کچھ ہے

غزلیں

سستے میں مل رہا ہے بہت دام کا نہیں
دنیا! ترا اثاثہ مرے کام کا نہیں

اِس دُکھ سے بڑھ کے اور اذیّت ملے گی کیا
دل میں دھڑکتا درد ترے نام کا نہیں

اُس کے نگر سے آتی نہیں ہے صبا تو کیا
میں منتظر ہی وصل کے پیغام کا نہیں

جی چاہتا ہے کوئی مجھے بے وفا کہے
اِس سے زیادہ لُطف ہی الزام کا نہیں

دل سے ہی اُٹھ رہا ہے سُلگتا ہوا دھواں
اب کے ہوا سے بجھتا دیا بام کا نہیں

آنکھوں میں سُرخیوں کا اَمر سلسلہ ہے کیا
منظر شفق شفق سا کہیں شام کا نہیں

امر مہکی

وہ لب پہ آئی ہوئی التماس روند گیا
نہ کچھ کہا نہ سُنا، دل کی آس روند گیا

کچھ ایسے تلخ سے لہجے میں بات کی اُس نے
کہ گفتگو میں رچی سب مٹھاس روند گیا

گھڑی میں گہرے تعلق کا انہدام ہوا
وہ عمر بھر کی رفاقت کا پاس روند گیا

ہمارے دُکھ کا ازالہ کسی نے کیا کرنا
اداسی جس کے لیے تھی اُداس روند گیا

بلکتے پیاسے کو پانی پلاتا کیا وہ اَمر
گلاس توڑ گیا اور پیاس روند گیا

غزل

تجھ میں کوئی نہیں کمی حد ہے
یہ تو حد سے کوئی بڑی حد ہے

میرے ہر اک گناہ کی حد ہے!!
اس کی رحمت کی کیا کوئی حد ہے؟

میں محبت کی بات کر رہا تھا
آپ نے بات کاٹ دی حد ہے

اس کے رخسار اور لب آنکھیں
حسن ایسا کہ حسن کی حد ہے

اس زمانے سے کیا گلہ لیکن
مجھ کو سمجھے نہ آپ بھی حد ہے

روح سے جسم کی رسائی تک
بس یہی نا؟ یہ آخری حد ہے؟

اپنے دشمن کی خیر مانگتا ہوں
یار ویسے یہ سادگی حد ہے

جانے کیسے یہ لوگ سوچتے ہیں
اس کے لب سی ہے پنکھڑی؟ حد ہے

تم محبت کی حد بتا رہے ہو
کیا محبت کی بھی کوئی حد ہے

جو ہمارا ہے نقطۂ آغاز
عام لوگوں کی آخری حد ہے

اپنی اوقات جان کر بھی صغیرؔ
اس کو احساسِ برتری، حد ہے

صغیر احمد صغیر

غزل

کوئی لوٹے بھی تو کیسے مری سرکار مجھے
جب نظر آنے لگا ہے پسِ دیوار مجھے

خواب میں میں نے غلامی سے بغاوت کردی
گویا اس نیند نے آ کر کیا بیدار مجھے

عشق کی ہوگئی اس وقت حماقت سرزد
جب سمجھنے لگے سب لوگ سمجھدار مجھے

بے حسی اپنی جگہ یار زمانے کی مگر
تو بھی ٹھہرا نہیں یوں دیکھ کے اس بار مجھے

روز کھاتا ہوں اسی مد میں نیا ایک فریب
کوئی اک آدھ تو مل جائے وفادار مجھے

اب سبھی درد گزر جاتے ہیں آرام کے ساتھ
وقت نے کردیا اس ڈھنگ سے ہموار مجھے

عزم الحسنین عزمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مجھ پہ ترے غم کا سائبان رہا ہے
دشت میں بھی سر پہ آسمان رہا ہے

غزل

مکاں سے لا مکاں تک آ گیا ہوں
خیالوں میں کہاں تک آ گیا ہوں

گذر کر میں زوالِ زندگی سے
عروجِ داستاں تک آ گیا ہوں

ترے ہونٹوں کی جنبش کہہ رہی ہے
کہ میں تیری زباں تک آ گیا ہوں

وہاں تک ہے مری اب حکمرانی
ترے اندر جہاں تک آ گیا ہوں

گذرتے وقت میں کچھ دن ٹھہر کر
میں عمرِ جاوداں تک آ گیا ہوں

در و دیوار تک وحشت زدہ ہیں
حقیقت میں گماں تک آ گیا ہوں

میں اپنے آپ سے ملنے کی خاطر
ہجومِ دوستاں تک آ گیا ہوں

پلٹنا اب کہاں ممکن ہے عاصم
میں خطرے کے نشاں تک آ گیا ہوں

عاصم اعجاز

غزل

دیارِ دِل میں ہنگامہ سر میدان ہوتا ہے
یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے علی الاعلان ہوتا ہے

بُہت دُشوار ہوتا ہے کسی کا دِل رفو کرنا
گریباں چاک کر دینا بہت آسان ہوتا ہے

شبیہہ رنج و فُرقت کا کوئی چہرہ نہیں ہوتا
فسانہ ہجر کا اکثر بلاعُنوان ہوتا ہے

عجب سی خُود فریبی ہے وفا کی آرزو کرنا
دِلوں میں وقف ہونے کا عجب رُجحان ہوتا ہے

کبھی محصُور لگتی ہے خُودی آزاد لمحوں میں
کبھی احساسِ مُختاری پسِ زِندان ہوتا ہے

ہمارے ذہن سے اخلاقؔ اِک مصرع نہیں بنتا
خلِش جب دِل سے اُٹھتی ہے تو پھر دیوان ہوتا ہے

اخلاق اکرم

غزل

چشمِ نم نے سیم بہانا چھوڑ دیا ہے
ہم نے اب دیوار کا شانہ چھوڑ دیا ہے

سب کچھ پہلے جیسا ہے پر اس سے کہنا
اک پنچھی نے گیت سنانا چھوڑ دیا ہے

اتنی گھاس کہاں اُگتی تھی پگڈنڈی پر
یارو تم نے آنا جانا چھوڑ دیا ہے

اس کیفے میں آج بھی کافی مل جاتی ہے
بس لوگوں نے شام منانا چھوڑ دیا ہے

اک دوجے کو ڈھونڈ کے کتنا خوش ہوتے تھے
بچپن کا وہ کھیل پرانا چھوڑ دیا ہے

اب کمرے کی تصویریں بھی چپ رہتی ہیں
دیواروں نے حال بتانا چھوڑ دیا ہے

تجھ سے جیت کے دل کا مہرہ پٹ جانا تھا
تیری خاطر مات کا خانہ چھوڑ دیا ہے

دل سے لپٹی بیل پرانی دیکھ رہے ہو؟
مت دستک دو.. کام.. کہا نا، چھوڑ دیا ہے

عاطف جاوید عاطف

غزلیں

ٹکرانے سے جو آگ اٹھی تھی اسی کا ہو
شاید کہیں پہ نقش تری روشنی کا ہو

لاکھوں طرح کی زندگی آباد ہے یہاں
ہر مسئلہ ضروری نہیں آدمی کا ہو

ناگاہ اس بدن سے لپٹتا ہوں بار بار
شاید یہی علاج مری بے کلی کا ہو

ہر چیز سے زیادہ ہے نسبت کی اہمیت
پتھر بھی کوئی مارے تو اس کی گلی کا ہو

شرکت ضروری ہوتی ہے تکمیل کے لیے
میں بھی کسی کا ہو گیا، تو بھی کسی کا ہو

ساقی گری تو آتی ہے سب کو بقدرِ ظرف
ہوتا ہے امتحان تو پھر دلبری کا ہو

حمزہ یعقوب

میں نے قسمت کو آزمایا تھا
وہ مری زندگی میں آیا تھا

ساتھ تیرے رہا جو برسوں سے
میں نہیں تھا وہ میرا سایہ تھا

خواب میں اک خیال تھا شاید
اس نے جیسے گلے لگایا تھا

میرے آنگن میں پھول کھلتے گئے
وہ جو بھولے سے مسکرایا تھا

وہ تصور تھا یا کوئی تصویر
تیرے آنے پہ کون آیا تھا؟

وقت ساکت، مقام بھی ساکت
حسن نے معجزہ دکھایا تھا

راجہ عبدالقیوم

غزل

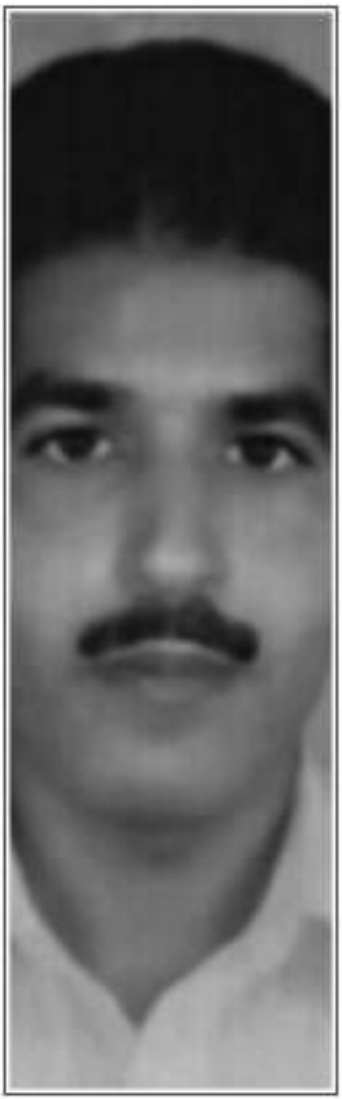

فضائے ہجر میں اب دیپ ہے کوئی نہ تارا ہے
ترے حسنِ ستم پیشہ نے یوں شب خون مارا ہے

ابھی تکمیل کے لاکھوں مراحل تھے پسِ پردہ
نہ جانے چاک سے پھر کوزہ گر نے کیوں اتارا ہے

اگر شاخِ تمنا کو ثمر آور نہیں ہونا
زمیں کی کوکھ سے پھر تو نے کیوں اس کو اُبھارا ہے

میں بحرِ بیکراں ہوں اور کہیں جانا نہیں مجھ کو
مری کوئی روانی ہے نہ میرا کوئی دھارا ہے

چلو واپس، اگر دُکھنے لگے چھالوں بھرے پاؤں
یہاں کس نے سرابِ عشق کا میدان مارا ہے

ذرا آ روبرو اک دوسرے کے درد کو سمجھیں!
نہ میں راتوں کی تاریکی نہ تو روشن ستارہ ہے

زمانے کی کٹھن راہوں میں جو گرنے نہ دے خود کو
وہی انسان اچھا ہے وہی انسان پیارا ہے

درونِ ذات فرحاںؔ جب اتر آئے ہو تم اے جاں!
مرا کچھ بھی نہیں ہے اب یہ جو کچھ ہے تمھارا ہے

سرور فرحان

غزل

کٹیا جو اک فقیر کی کم تر دکھائی دے
دیکھو تو قصرِ شاہی سے بڑھ کر دکھائی دے

اس بدنصیب سا بھی کوئی بدنصیب ہے
جس کو زمینِ عشق بھی بنجر دکھائی دے

جس کی تلاش ہو وہ دکھائی نہ دے کہیں
جس کو نہ دیکھنا ہو وہ اکثر دکھائی دے

ممکن ہے ایک روز وہ آئے مرے بھی گھر
ممکن ہے ایک روز یہ گھر، گھر دکھائی دے

اتنی سکت نہیں ہے کہ اندر ہی جھانک لوں
روزن سے جھانکتا ہوں کہ باہر دکھائی دے

لگتا ہے یہ بھی میر کی غزلوں کا ہے اثر
مجھ کو جو چاند میں پری پیکر دکھائی دے

یارو! جمالِ یار بھی آنکھوں سے دیکھنا!
آنکھوں بغیر دیکھو کہ بہتر دکھائی دے

امتیاز انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کو چھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

غزل

کسی بھی جاتے ہوئے شخص کو صدا مت دو
جو بجھ رہا ہے دیا تو اسے ہوا مت دو

یہ سانس دکھتی نہیں ہے مگر ہے قیمتی چیز
یہ عشق وشق کے چکر میں تم گنوا مت دو

وہی کرو جو تمہیں لگ رہا ہے جائز ہے
مری وفا کا مجھے تم کوئی صلہ مت دو

چلو کہ ہم ہیں محبت میں کچھ نیا کرتے
وفا کے بدلے وفا دو مجھے جفا مت دو

تمھارا ہجر کلیجے میں تیر جیسا ہے
فرحؔ مجھے تو محبت کی تم سزا مت دو

فرح شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اے سحرِ فراق، کیوں؟ ایک یہی مذاق کیوں؟
موجِ ملال کس لیے رودِ نگاہِ یار میں

غزلیں

وہ جو دیکھا تھا کہیں ، یاد نہیں
آسماں تھا کہ زمیں ، یاد نہیں

ڈھیر ہیں راکھ کے چاروں جانب
بستیاں کیسے جلیں ، یاد نہیں

عہد و پیماں کی اُچھلتی لہریں
کس سمندر میں گئیں ، یاد نہیں

گیت ہی گیت تھے یا رنگ ہی رنگ
ہم مکاں تھے کہ مکیں ، یاد نہیں

تیرہ بختی سے رِہا جس نے کیا
اب وہ مہتاب جبیں ، یاد نہیں

وہ حسیں صبحیں ، نشیلی شامیں
ہم سے کیوں روٹھ گئیں ، یاد نہیں

کیوں بنا ہجر مقدر شانؔی
کیا ہوا خواب حسیں ، یاد نہیں

عقیل شانؔی

کیا مقدر نے گُل کھلائے ہیں
میرے حصّے میں خار آئے ہیں

یہ نہ سمجھو کہ غم نہیں اُس کو
گیت خوشیوں کے جس نے گائے ہیں

منزلیں اُس کی راہ کیوں دیکھیں
حوصلے جس کے ڈگمگائے ہیں

غم کے طوفاں نے اُن کو گھیر لیا
اپنا ساحل جو چھوڑ آئے ہیں

کس نے چھیڑا ہے دل کے زخموں کو
اشک آنکھوں میں جگمگائے ہیں

زندگی شادماں کہیں بھی نہیں
ہر طرف بے بسی کے سائے ہیں

موتیوں کے دیار سے شانؔی
ہم بھی کنکر سمیٹ لائے ہیں

غزل

آبشاروں سے بات کرنی ہے
کوہساروں سے بات کرنی ہے

کون تم کو جگائے رکھتا ہے
ان ستاروں سے بات کرنی ہے

مجھ کو قبروں کی سمت جانا ہے
اپنے پیاروں سے بات کرنی ہے

عشق والوں کا کیا کِیا تم نے
ریگزاروں سے بات کرنی ہے

بھید پانا ہے ذات کا اپنی
رازداروں سے بات کرنی ہے

کیا سفر پہ ہیں منزلیں میری
رہ گزاروں سے بات کرنی ہے

چین کیسا ہے بے قراری میں
بے قراروں سے بات کرنی ہے

تم نے شعلوں میں کب بدلنا ہے
یہ شراروں سے بات کرنی ہے

سر پہ چادر بھلی کہ مرقد پہ
یہ مزاروں سے بات کرنی ہے

شدتِ غم سے بولنا مشکل
سو اِشاروں سے بات کرنی ہے

مل کے لڑنا ہے اب خزاؤں سے
یہ بہاروں سے بات کرنی ہے

یہ لو حاضر ہیں آبلے میرے
خارزاروں سے بات کرنی ہے

موجِ دریا سے کچھ چھپانا ہے
اور کناروں سے بات کرنی ہے

اب انھیں دیکھنے سے قاصر ہوں
اب نظاروں سے بات کرنی ہے

داد دینی ہے ان کے خالق کو
شاہکاروں سے بات کرنی ہے

چند خوشیاں ہیں میرے پاس عطاؔ
غم کے ماروں سے بات کرنی ہے

عطا العزیز

غزلیں

دامَنِ اقتدار بھی کیا خوب
قوم کا انتشار بھی کیا خوب
الفتِ شوق ، دید سے محروم
حسن کا انتظار بھی کیا خوب
روئے تاباں سے بام و در کی ضیاء
یار کیا، کوئے یار بھی کیا خوب
آمدِ حسنِ ناز اے ہمدم
باعثِ افتخار بھی کیا خوب
گفتگو میں رہا تھا جو ابہام
بات کا اختصار بھی کیا خوب

دامَنِ دل ہے تار تار مرا
رہ گزر، خاردار بھی کیا خوب
طشت از بام کر دیا قصہ
ساتھ ہیں رازدار بھی کیا خوب
سامنے میرے انکسارِ غنیم
ہائے یہ انکسار بھی کیا خوب

لبنیٰ مقبول

عشق و مہر و وفا سے عاری ہے
زندگی پھر بھی مجھ کو پیاری ہے

بات بے بات ہنس رہی ہوں جو
غم کی بس اپنے پردہ داری ہے

حوصلہ تو بلا کا تھا مجھ میں
وقت کا وار اب کے کاری ہے

دل نہیں اب جہان میں لگتا
بڑھ گئی دل کی بیقراری ہے

میرے رستوں پہ گل مہکتے ہیں
فیض ان کی وفا کا جاری ہے

نائلہ راٹھور

غزلیں

وقت کا ارتکاز ہیں ہم لوگ
صاحبِ امتیاز ہیں ہم لوگ

ہم جلاتے ہیں شاعری سے دیے
روشنی کا جواز ہیں ہم لوگ

تم پرندوں کی سبز سرگم ہو
نیلے جھرنوں کا ساز ہیں ہم لوگ

خود پہ کھولے نہیں گئے برسوں
میرے ہم راز! راز ہیں ہم لوگ

تو نے ہاتھوں سے لکھ دیا تھا ہمیں
تیرے واحد مجاز ہیں ہم لوگ

ہم بھی اہلِ رموز ہیں سو رمیضؔ
اپنے یاروں کا ناز ہیں ہم لوگ

رمیض نقوی

ہماری وحشت لگے ٹھکانے کسی بہانے
کوئی تو آئے ہمیں منانے کسی بہانے

کبھی کراؤں گا سیر تجھ کو میں شہرِ دل کی
کبھی دکھاؤں گا سرد خانے، کسی بہانے!

صفِ حریفاں میں چند پیارے بھی آ گئے ہیں
سو باندھنے ہیں غلط نشانے کسی بہانے

لگا ہی دینی ہیں قدغنیں بے سبب ہنسی پر
اداس بستی کے دیوتا نے کسی بہانے

یہ لوگ اک عمر سے اسی میں لگے ہوئے ہیں
کہ زخم تازہ کریں پرانے کسی بہانے

توقیر احمد

غزل

مان کتنا تھا اک سہارے پر
اُس محبت کے استعارے پر

وہ عیادت کو بھی نہیں آیا
جان دیتا تھا جو اشارے پر

لوگ سب جا چکے مرے اُس پار
اور میں رہ گئی کنارے پر

ہم نے دنیا بسائی پھر اپنی
درد کے آخری ستارے پر

دل کا قرآن کھول کر دیکھا
نام اس کا ہے پارے پارے پر

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ سفر، سَر بہ سَر رائیگاں بھی نہیں
کارِ دل محض کارِ زیاں بھی نہیں

غزل

دریا برد ہوا
پھول ، سوال ، دیا

گزری باتیں چھوڑ
تازہ بات سنا

دل پر داغ نہ دے
اے شفاف قبا

دل انگارہ ہے
جاں کو برف کیا

تجھ کو جیتنے میں
خود کو ہار دیا

دنیا دیکھ چکا
رتھ آگے سرکا

روٹی پانی ہے
صبر و شکر کیا

اِدھر اُدھر نہ دیکھ
خود سے آنکھ ملا

سب روشن ہو گا
دل سے دھول ہٹا

دنیا پل بھر کی
برسوں میں سمجھا

پلک جھپکتے ہی
ہر منظر بدلا

مرنے والوں نے
رستہ سہل کیا

جو اعجاز سُنے
اس کو حال سنا

اعجاز رضوی

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے ملہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانح عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

"اس میں حرج ہی کیا ہے" وہ مسکرا کر بولے "اگر ایک پردیسی کا دل خوش ہو جائے تو ساڈا کی وگڑ دا اے" سیکرٹری کے برتن سمیٹتے ہی بنٹی کیمرہ لئے آ دھمکے گا۔ ہر اجنبی کے ساتھ فوٹو کھنچوانا ان کی ہابی ہے اور اس میں کوئی رعایت نہیں کرتے۔ البتہ ملاقاتیوں کے رجسٹر پر اپنے تاثرات قلمبند کرنا مہمان کی صوابدید پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ اصرار نہیں کرتے۔

فلم انڈسٹری کے ساتھ ان کے خاص روابط ہیں۔ فلمی حلقوں میں ان داتا کے نام سے مشہور ہیں۔ جب بھی کوئی پاکستانی

فلمساز آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے تھائی لینڈ جاتا ہے تو سیدھا جا کر مہاراجہ کا دامن تھام لیتا ہے۔ وزارت داخلہ سے عدم اعتراض کا سرٹیفکیٹ، حکومت سے لمبے عرصے کے لئے قیام کی اجازت، صوبائی گورنر سے خصوصی مراعات، ہیرو اور ہیروئن کے لئے عمدہ ہوٹلوں میں ریزرویشن، ایکسٹراز کے لئے لمبی بارکوں میں لیٹنے کا بندوبست، مہاراجہ ہی کرتے ہیں اور اس کے لئے کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتے۔ تمام ایکٹرسوں کو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر بابرا شریف کے ساتھ انہیں بڑا اُنس ہے۔ کہنے لگے جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی بڑی بیٹی کنول یاد آ جاتی ہے جو برکلے میں تعلیم حاصل کر رہی ہے۔

پاکستان واپسی کے لئے میرا پین ایم کے ساتھ کچھ اختلاف چل رہا تھا۔ ٹکٹ کے معاملے میں وہ کچھ گھپلا کر رہے تھے۔ میں اپنی اس پریشانی کا مہاراجہ سے ذکر کر بیٹھا۔ سردار جی فوراً اشتعال میں آ گئے اور پنجابی میں ایک وزن دار گالی دے کر اُٹھ کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے ''چلو میں ابھی اس بھوتنی کے سے نمٹ لیتا ہوں''

''لیکن خدا کے لئے وردی پہن کر نہ جائیں۔''

کہنے لگے ''جس دن وردی پہن کر گیا سالوں کا دفتر ہی بند کرا دوں گا۔'' دکان سے نکل کر ہم سیام اسکوائر کی طرف جا رہے تھے کہ سامنے سے بابرا شریف آتی دکھائی دی۔ بابرا نیلی جین اور سفید چکن کے نصف آستین والے کرتے میں ملبوس تھی۔ سردار جی کو دیکھتے ہی وہ ڈیڈی کہہ کر پوری رفتار سے دوڑی ''اوہ میری دھی'' کہہ کر سردار جی نے بازو پھیلا دیے۔ میرا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے ''ڈاکٹر صاحب سے ملی ہو - یہ بھی تمہارے لاہور کے رہنے والے ہیں۔''

''یہ آپ نے مجھے ڈاکٹر کب سے بنا ڈالا ہے؟'' میرے احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگے ''کیا علامہ اقبال نسخے لکھتے تھے؟''

''نہیں تو''

''تو پھر ڈاکٹر کیوں کہلواتے تھے؟'' مہاراجہ نے ہنسی کی پھلجھڑی چھوڑی۔

بابرا کو کہنے لگے ''تم دکان پر بیٹھو میں ابھی پین ایم (PAN-AM) والوں کی ایسی تیسی کر کے آتا ہوں'' بابرا چلی گئی تو کہنے لگے ''یہ بڑی سعادت مند بچی ہے۔ دراصل مجھے پاکستان کے سارے فلم سٹارز پسند ہیں، سوائے شمیم آرا کے''

''ہاں اس ستارے کی چمک اب ماند پڑ گئی

ہے" میں نے چھیڑا۔

"بڑی کنجوس ہے" سردار جی مسکرائے "جب بھی آتی ہے اُلٹا مجھ سے ہی خرچ کروا جاتی ہے۔"

مہاراجہ مصائب کا ایک سمندر عبور کر کے ساحل مراد پر پہنچے تھے۔ یہ زندگی کے ایک ایسے دوراہے پر کھڑے تھے جہاں پیچھے ان کا گرد آلود ماضی تھا اور آگے روشن مستقبل۔ ماضی جوان کا اپنا تھا، مستقبل جو دوسروں کے لئے وقف تھا۔ ترقی کی ہوش رُبا راہوں پر چلتے ہوئے بھی وہ ان پگڈنڈیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکے تھے جہاں ان کا بچپن گزرا تھا۔ مکئی کے کھیت، وہ باجرے کی روٹی، وہ سکول میں تختیوں سے لڑنا، وہ گڑ کی روڑی پر شرط لگا کر پنجہ لڑانا، وہ چپکے چپکے روشنائی کی ساری دوات پی جانا، انہیں کچھ بھی تو نہ بھولا تھا۔ بڑے فخر بڑے غرور کے ساتھ جب وہ اپنے بچوں کو یہ واقعات سناتے تو وہ بڑی حیران کن نظروں سے اس بوڑھے سکھ کو دیکھتے "ڈیڈی! کیا آپ اپنی داڑھی سے یہ گرد جھاڑ نہیں سکتے؟" ایک دن نیویارک میں زیر تعلیم بیٹے نے ان سے کہا۔

"نائیں بیٹا نائیں" سردار جی آبدیدہ ہو گئے۔ یہ گرد میرے اندر میری روح پر جم گئی ہے اسے دنیا کا کوئی شیمپو کھرچ نہیں سکتا۔

بنکاک میں ایک طویل عرصے تک رہنے کے باوجود مہاراجہ بنیادی طور پر ایک مذہبی شخص ہیں۔ ہر روز علی الصبح اُٹھنا، اشنان کے بعد گرنتھ صاحب کا پاٹ، دکان کھولتے ہی بابا گرونانک کی تصویر کو پرنام کرنا اور اپنے ہاتھوں سے اگربتیاں جلا کر تصویر کے اردگرد ٹانکنا، لاٹری کے تازہ خریدے ہوئے ٹکٹوں کو بابا جی کے چرنوں سے مس کرنا ان کے معمولات میں شامل ہے۔ ایک دن جوش کہنے لگے "سردار جی! لاٹری تو جوا ہے اور جوا اگر حرام نہیں ہے تو کم از کم مکروہ ضرور ہے پھر آپ بابا جی سے کیسے توقع رکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں آپ کو مزید موٹا کریں گے۔" بس ایک نظر کرم چاہئے۔ اِک نظر کرم، زندگی سپھل ہو جائے گی۔ مہاراجہ بولے "تمہارے خیال میں جو گنہگار انسان ہیں کیا رب انہیں رزق نہیں دیتا؟" اگر ایسا ہوتا تو آج سارے مولوی، سب پنڈت، تمام گیانی لکھ پتی ہوتے اور تم" مہاراجہ مسکرائے "بنکاک آوارہ گردی کرنے کی بجائے بانو بازار میں چوڑیاں بیچ رہے ہوتے۔"

باوجود سکھ مذہب سے تعلق رکھنے کے مہاراجہ کو اسلام اور اولیائے دین سے گہرا لگاؤ ہے۔ جب مہاراجہ ٹیلرنگ کے افتتاح کا وقت آیا تو انہوں نے سب سے پہلے قرآن

خوانی کروائی اور نیاز دلوائی۔ کہنے لگے ''جس جگہ قرآن خوانی ہو جائے وہ جگہ بابرکت بن جاتی ہے اور ہر قسم کی بلیات سے محفوظ، ویسے بابا جی بھی اکثر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔''

اسی طرح بابا گرونانک کے حوالے سے ولی قندھاری کا ذکر بڑے احترام سے کرتے۔ ایک دن حسن ابدال کا ذکر چھڑا تو کہنے لگے لوگ اسے چشموں اور لوکاٹوں کے حوالے سے جانتے ہیں لیکن اس شہر کو سب سے بڑا شرف یہ حاصل ہے کہ ولی قندھاری کا مسکن رہا ہے۔ پنجہ صاحب کے دربار پر کھڑے ہو کر جانب مشرق دیکھیں تو سب سے اُونچی پہاڑی پر بابا جی کا مزار ہے۔ بابا جی بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ مہاراجہ نے احتراماً دونوں کانوں کی لوؤں کو شہادت کی انگلی سے چھوا ''بہت پہنچے ہوئے بابا گرونانک سے بھی بڑے لیکن ایک دن ٹوٹ کر سرمست ان کو کر گیا ان کا سیو۔ کسی جلالی کیفیت میں ایک بھاری پتھر کو پہاڑی کے نیچے ڈیرہ ڈالے ہوئے بابا گرونانک پر پھینک دیا۔ بابا گرونانک نے ہاتھ کے اشارے سے اسے راستے میں روک لیا اور کہنے لگے ''اوئے ولیا! اتے ہی اتے ویکھی جاندا ایں، کدی نیویں تھاں وی ویکھ لیا کر۔ چنانچہ یہ بات باباولی کی سمجھ میں آ گئی۔ آج اُوپر پہاڑی پر ولی قندھاری کی عمل داری ہے اور نیچے بابا گرونانک کے فیض کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور خلق خدا اپنے اپنے رنگ، اپنے اپنے مسلک کے مطابق سرشار ہو رہی ہے۔

ویسے تو سارے سردار صاحبان زندہ دل ہوتے ہیں اور ہمت و جرأت کے ساتھ بات کہنے اور بات سننے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں لیکن مہاراجہ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان میں حس مزاح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ حاضر جوابی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آدمی چاہے سارا دن ان کے پاس بیٹھا رہے تھکن کا احساس نہیں ہوتا۔ ہنسا ہنسا کر ملاقاتی کو ہلکان کر ڈالتے ہیں۔ دو چار نہیں بلکہ پہلی ملاقات میں ہی کھل جاتے ہیں۔

ایک دن جوش کہنے لگے سردار جی! آپ نے ماناں والہ سے بنکاک تک ایک لمبی جست لگائی ہے۔ تعلیم بھی آپ کی شکل صورت کی طرح واجبی ہے۔ دیار غیر تھا، کسمپرسی کا عالم تھا لیکن آج کل آپ بنکاک کے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آخر آپ کی کامیابی کا راز کیا ہے؟

''اس کی وضاحت فرمائیں گے؟'' جوش نے تجسس آمیز لہجے میں پوچھا۔

''اب اس کی وضاحت بھی مجھ سے ہی کراؤ

ہے!" مہاراجہ مسکرائے۔ "محنت کا اپنا مقام ہے، اس کی اپنی خوشبو ہے، ڈالر بنکاک کے درختوں پر نہیں اُگتے۔ اس کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے" لیکن قرائن اور شواہد سے تو یہ پتہ چلتا کہ آپ محنت بھی کرتے ہیں اگر سارے دن میں آپ کے چلنے کی اوسط نکالی جائے تو یہ کرسی اور کار کا درمیانی فاصلہ بنتا ہے۔ جوش نے چھیڑا۔

"تمہارے جسم کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہے" مہاراجہ تلملائے "یہ جو تم آج کل دیکھ رہے ہو یہ محنت نہیں، محنت کا ثمر ہے۔ اگر میری جگہ تم ویت نام میں ہوتے تو امریکی فوجی وردی کے بجائے درختوں کے پتوں سے اپنا تن ڈھانپتے۔ توپوں کی اس گھن گرج میں، جہازوں کی اس دل ہلا دینے والی گڑگڑاہٹ میں، گولیوں کی تڑتڑ کی پروا کئے بغیر یہ خالصہ، جنگل جنگل، مورچہ مورچہ پھرا ہے، نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا۔ مہاراجہ اپنی بھاری آواز میں گنگنانے لگے "اور دیانت؟" جوش کا اشتیاق بڑھنے لگا۔

بولے "کاروبار میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ زبان سے جو لفظ ایک بار نکل گیا وہ پتھر پر لکیر بن گیا۔ بددیانتی اور دروغ گوئی زیادہ دیر تک اپنا بھرم قائم نہیں رکھ سکتیں۔ وہ تم نے ابراہیم لنکن کا قول تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک شخص کو ساری زندگی بے وقوف بنا سکتے ہو۔ سب لوگوں کو ایک مرتبہ غچہ دے سکتے ہو، لیکن تمام لوگوں کو ہمہ وقت دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

چلئے یہ بھی مان لیتے ہیں۔ جوش عمداً تشکیک آمیز لہجے میں بولے "لیکن خوشامدی شخص کی تو کہیں بھی قدر نہیں ہوتی۔"

"ہوتی ہے! مہاراجہ جوش کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ دراصل خوشامد بھی ایک فن ہے اور میری طرح اچھا فن کار ہی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تھائی بادشاہ کو ہی لے لو، غیر ملکیوں میں معدودے چند لوگ ہی ایسے ہیں جن کی رسائی مہاراج تک ہے۔ دیدار عام کے وقت اگر کوئی تھائی لاکھ بات کا نذرانہ دے تو میں پانچ لاکھ پیش کرتا ہوں۔ اگر لوگ بوقت ملاقات تعظیماً دوزانو ہوتے ہیں تو میں پاس ادب سے عالم پناہ کے گھٹنوں سے لپٹ جاتا ہوں۔"

اس سدا بہار مہاراجہ کو ایک دن میں نے بہت اُداس دیکھا۔ اندرا گاندھی قتل ہو گئی تھیں اور دوسرے دن میں اتفاقاً بنکاک آیا ہوا تھا۔ مہاراجہ کو ملول دیکھا تو سوچا چلو افسوس ہی کر لیتے ہیں۔

"بڑے دکھ کی بات ہے کہ آپ کی

وزیر اعظم قتل ہو گئی ہیں" سردار جی نے قہر آلود نگاہوں سے مجھے دیکھا اور زہر آلود لہجے میں پنجابی زبان کی ڈکشنری کو قریباً کھنگالتے ہوئے بولے "تمہیں ایک شخص کے قتل پر تو افسوس ہے لیکن ان بیس ہزار خالصوں کی موت کا کوئی دکھ نہیں جو بے گناہ مارے گئے ہیں۔" بہت غلطی ہوئی ہے ہم سے۔ بڑا انیائے کیا ہے ہم نے۔ کاش اس وقت ہم تم مسلوں کی بات مان لیتے"

مہاراجہ کف افسوس ملنے لگے۔

پاکستان آنے سے قبل میں الوداعی ملاقات کے لئے بنکاک گیا۔ مہاراجہ حسب دستور مسکرا رہے تھے۔

"کیا بات ہے سردار جی! کہیں لاٹری تو نہیں نکل آئی؟" مہاراجہ ان دنوں لاٹری کے ٹکٹ باقاعدگی سے خریدتے تھے۔

"نکلوا لئے ہیں۔ سب نکلوا لئے ہیں" وہ خوشی سے بولے "آخر کیا نکلوا لیا ہے آپ نے؟"

"ڈالر، ڈالر، میں نے ہندوستانی بنکوں سے اپنی ساری رقوم نکلوالی ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اتنے بڑے ملک کی معیشت چند ہزار یا چند لاکھ ڈالروں سے کیا متاثر ہوگی۔"

کہنے لگے ابتدا ہمیشہ اسی طرح ہوتی ہے۔ جس طرح بارش کا پہلا قطرہ دریاؤں کو بھرتا ہے اسی طرح پہلا روپیہ خزانوں کو خالی بھی کر سکتا ہے۔"

"میں وطن واپس جا رہا ہوں۔ سوچا آپ سے ملتا چلوں۔"

"اتنی جلدی!" امرجیت سنگھ پھر آبدیدہ ہو گئے۔

"چھ ماہ ہو گئے ہیں"

"مجھے تو چھ منٹ پتہ چلتے ہیں"

"یہ سکھوں کی پرانی عادت ہے۔"

ہنس کر بولے "ارے کہیں تم نے سردار جی کا وہ لطیفہ تو نہیں سن لیا جس میں انہیں سات سال قید ہو گئی تھی۔ دوستوں کو کہنے لگے، دل چھوٹا نہ کرو۔ یہ سات سال تو سات گھنٹوں میں گزر جائیں گے۔"

"آپ کو مل کر مزید کسی لطیفے کی گنجائش نہیں رہتی"

جب میں نے جانے کی اجازت مانگی تو میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "ایک بات مانو گے؟......"

"فرمایئے......"

"سنا ہے تم کچھ لکھتے وکھتے بھی ہو؟"

"ہاں تھوڑا بہت!"

"مجھ پر کچھ لکھو گے؟" سردار جی کی آنکھوں میں اس بچے کی سی التجا تھی جو کھلونے لینے پر مصر ہو۔

"آپ سوچ لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تحریر

آپ کے لئے یا میرے لئے کسی پریشانی کا باعث بن جائے۔"

"خالصہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ سمجھے" پھر کچھ سوچ کر بولے "لیکن لکھنا ٹھیک ٹھاک۔ نہیں تو بنکاک تو تم نے کبھی نہ کبھی آنا ہی ہے۔"

انہوں نے اپنی داڑھی پر تنبیہ کے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ مجھے ٹیکسی تک چھوڑنے آئے۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولے "اگر محسوس نہ کرو تو کرایہ میں دے دوں؟"

میں نے کہا "آپ کی بڑی مہربانی لیکن یہ تھوڑے سے باٹ رہ گئے ہیں مجھے انہیں بہر طور ختم کرنا ہے، پاکستان میں ان کا کوئی مصرف نہیں ہوگا۔"

"ان سے ہوائی اڈے پر بچوں کے لئے سنگتریاں خرید لینا!" سردار جی کے لہجے میں بچوں کی سی معصومیت تھی۔

کروکوڈائیل فارم: اگر مہاراجہ سے ملاقات نہ ہوتی تو شاید ہم ان پانچ مقامات کو ٹھیک طرح سے نہ دیکھ پاتے۔ ان میں کم از کم ایک جگہ ایسی ہے جہاں یقیناً کٹ جاتے یا پٹ جاتے۔

جوش کہنے لگے مہاراجہ جی ہمیں اصل مگرمچھ دکھائیں۔ مہاراجہ ان کے طنز کو بھانپتے ہوئے بولے "برخوردار آئینہ دیکھ لو" اس طنز کے باوجود مہاراجہ اپنے "بڈھے چتر" کی فرمائش ٹال نہ سکے۔ کہنے لگے "اتوار کو چھٹی ہوتی ہے تم بھی آ جانا۔ ایسا نظارہ دنیا بھر میں دیکھنے کو نہیں ملے گا۔"

جب ہم ٹکٹ لے کر فارم کے اندر داخل ہوئے تو بائیں ہاتھ ریسٹورنٹ کے مینو بورڈ پر لکھا تھا آج کی ڈیلی کیسی، مگرمچھ کا سوپ، جوش نے مہاراجہ کو سوپ پینے کی دعوت دی۔ مہاراجہ کہنے لگے:

You want to stew in your own juice?

"تو اور کیا ریچھ کا سوپ پیوں؟" جوش جواب آں غزل کے ماہر تھے۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ذرا آگے بڑھے تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ شاید فاک لینڈ میں اتنی بھیڑیں نہیں ہوں گی۔ آسٹریلیا میں اس قدر کانگرو نہیں ہوں گے جتنے مگرمچھ تھائی لینڈ میں ہیں۔ ہر عمر اور ہر نسل کے مگرمچھ آہنی جنگلوں کے پیچھے آزادانہ گھوم رہے تھے۔ ان کی سائنٹفک بنیادوں پر پرورش کی جاتی ہے۔ لوگ اس کا گوشت رغبت سے کھاتے ہیں جو خاصا مہنگا ہے۔ اس کے چمڑے سے لیدر شوز کی بہت بڑی صنعت چلتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی انسان کے ساتھ کشتی بھی دکھائی جاتی ہے۔ دن میں دو دفعہ شو ہوتا ہے۔ ایک تالاب میں چند مگرمچھ چھوڑے جاتے ہیں۔ لوگ جنگلے کے اوپر کھڑے ہو کر

تماشا دیکھتے ہیں۔ ایک پستہ قد شخص دنگے میں چھلانگ لگا کر داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی ہوتی ہے جس سے وہ مگرمچھوں کو چھیڑتا ہے۔ اس کی چھڑی کو دیکھ کر مگرمچھ یوں منہ پھیر لیتے ہیں جس طرح کوئی شریف آدمی محلے کے غنڈے کی بڑھکیں سن کر دامن بچا کر نکل جاتا ہے۔ اس پر وہ کانگڑی پہلوان لوگوں کی طرف دیکھ کر داد وصول کرتا ہے۔ پھر وہ چھڑی سے مگرمچھ کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔ بعینہٖ جس طرح چوہدری لوگ کیسوں کی جھاڑ پونچھ کرتے ہیں۔ جب مار پیٹ پر بھی مگرمچھ ٹس سے مس نہیں ہوتے تو وہ چھلانگ لگا کر مگرمچھ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا ہے اور دھادھم کودنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر اسے دم سے پکڑ کر چبوترے پر لے آتا ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں سے زخمی مگرمچھ کے جبڑے کھول دیتا ہے۔ جب اس کا منہ پوری طرح کھل جاتا ہے تو وہ اپنا سر اس کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ اس لمحے تماشائیوں پر تفریح کی بجائے خوف سوار ہو جاتا ہے۔ سانسیں رک سی جاتی ہیں اور وجود لرزنے لگتے ہیں۔ حیرت اور تجسس سے ہر نگاہ ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ سیاحوں کے کیمرے کلک، کلک کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ اس خونی کے منہ سے اپنا سر صحیح سلامت باہر نکالتا ہے تو دیر تک تالیاں بجتی رہتی ہیں۔ اب جو وہ ایک نگاہ حاضرین پر ڈالتا ہے وہ فاتحانہ نہیں عاجزانہ ہوتی ہے۔ التجا بھری، جیسے وہ اپنی بہادری کی داد نہیں چاہتا اپنی کامیابی کی مبارک باد نہیں مانگتا صرف پاپی پیٹ کا ایندھن طلب کرتا ہے۔ اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کے چراغ جگمگاتے نہیں ٹمٹماتے ہیں۔ سینے کی دھونکنی سے نکلتی ہوئی ہر سانس پسلیوں کو اور نمایاں کر دیتی ہے۔ تالیوں کے اس شور میں ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا جاتی ہے۔ ایک سکہ ٹن سے فرش پر گرتا ہے۔ پھر دوسرا..... اس کے بعد سکوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ عصر حاضر کے گلیڈیٹر ہیں، دورِ نو کے رستم ہیں۔ انہیں بہادری کے صلے میں کوئی حور شمائل نہیں چاہئے کسی ڈی لائلہ کے طلب گار نہیں۔ کسی فردوس کی تلاش بھی نہیں۔ انہیں بس پیٹ بھر کھانا چاہئے۔ دو وقت کی روٹی درکار ہے۔

اس کے بعد ہم نے ہاتھیوں کا شو دیکھا۔ ہاتھی فٹ بال میچ کھیلتے ہیں اور پاپ میوزک پر باقاعدہ ڈانس کرتے ہیں۔ جب ہم باہر نکلے تو جوش کی رگ ظرافت پھڑکی۔ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولے ''مہاراجہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نیلرنگ میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اگر یہاں شوکریں

تو زیادہ پیسے کما سکتے ہیں۔ کانگڑی پہلوان تو مگرمچھوں کو چھڑی سے ڈراتا ہے۔ آپ صرف پگڑی اُتار کر کیس کھول دیں تو ڈر کے مارے سارے مگرمچھ بے ہوش ہو جائیں گے۔

"ہاں! درست فرمایا ہے" مہاراجہ بھی اتنی ہی سنجیدگی سے بولا "اگر آپ شمولیت اختیار کریں تو ہاتھیوں کا فٹ بال میچ مزید دلچسپ بنایا جا سکتا ہے۔"

ایشیا کی ویشیا: اگلے دن مہاراجہ ہمیں پٹایا بیچ دکھانے لے گئے۔ پٹایا بنکاک سے سو میل کے فاصلے پر ہے۔ پوکھٹ کے علاوہ یہ دوسری مشہور بیچ ہے۔ اگر بیچ کو عورت سے تشبیہ دی جائے تو یہ ایشیا کی ویشیا ہے۔ جب ویت نام میں جنگ ہو رہی تھی تو امریکی فوجی یہاں چھٹیاں منانے آتے تھے۔ اس سے سستی عیاشی، اتنی برہنہ فحاشی، شاید اور کسی جگہ ممکن نہیں۔

پٹایا بیچ عادت اور مزاج کے اعتبار سے دیگر بیچز سے قطعی مختلف ہے۔ باوجود کم عمری کے عیار ہے۔ بظاہر تغافل میں ہوشیار ہے۔ دن کو جائیں تو زاہد خشک، رات کو دیکھیں تو عنبر و مشک، حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی۔ مچلتی، اٹھکیلیاں کرتی ہوئی۔ اس کے بھی کئی رنگ ہیں کئی روپ ہیں۔ دن کو وسیع نیلگوں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کے سینے پر بادبانی کشتیاں راج ہنسوں کی طرح ڈولتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ موٹر لانچوں کے ذریعے لوگ نائیلون کی رسی سے بندھے ہوئے پیراشوٹ غباروں کے ساتھ ہوا میں اُڑ رہے ہوتے ہیں۔ پیراکی کے لباس پہنے جوان عورتیں اور بوڑھے مرد نسبتاً کم گہرے پانی میں ڈبکیاں لگا رہے ہوتے ہیں۔ ساحل کی ریت پر لیٹے ہوئے سیاح بھاری بھرکم عورتوں سے مساج کرواتے ہیں۔ مساج یہاں ایک آرٹ ہے جس کے ذریعے جسم سے تھکن کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جاتا ہے۔ اصل مساج بھی انہیں ساحلوں پر دن دہاڑے، کھلے بندوں ہوتا ہے کیونکہ مساج شب، مساج نہیں ہوتا مصلحت شب ہوتی ہے جو تاجران جشن طرب کا تعاقب کرتی ہے۔ ساحل پر آدمی میلوں ننگے پاؤں ریت پر چل جاتا ہے لیکن تھکن کا احساس نہیں ہوتا، شوق ختم نہیں ہوتا، وہاں آرام دہ پلاسٹک کی کرسیاں بچھی ہوتی ہیں جن پر سیاح نیم دراز ہو کر سارا دن پائین ایپل کھاتے رہتے ہیں اور کوکا کولا سے پیاس بجھاتے ہیں۔ ہر طرف اطمینان بخش سکون چھایا رہتا ہے، ہر شخص اپنے آپ میں گم نظر آتا ہے۔ یہ منظر غروب آفتاب تک رہتا ہے۔ جیسے ہی سورج ڈوبتا ہے، رات طلوع ہوتی ہے۔ پٹایا کی حسینہ ایک

بھرپور انگڑائی لے کر اٹھتی ہے اور جب اپنی خوابیدہ آنکھیں دھیرے دھیرے کھولتی ہے تو ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی نہیں ہوتی بلکہ ساری کی ساری شراب ہوتی ہے۔ ایسے ماحول میں سمندر سادھو نظر آتا ہے۔ چاند چور اور بنات النعش گردوں عریاں ہو کر زمین پر اُتر آتی ہیں۔ جوں جوں تاریکی بڑھتی ہے روشنیاں ہر طرف بکھر جاتی ہیں۔

پانچ میل پھیلے ہوئے ساحل کے ساتھ ساتھ پانچ میل لمبی سڑک ہے اور سڑک کے دوسرے کنارے پر اتنے ہی رقبہ میں پھیلے ہوئے ان گنت مے خانے ہیں، ہر بار میں دس بارہ سٹول رکھے ہیں اور ہر سٹول پر دو تین حسینائیں مے ناب سے چھلیں کرتی نظر آتی ہیں۔ سرخ اور سفید شراب، فوارے کی طرح بوتل سے نکلتی ہوئی شیمپین، سمندر کی جھاگ کی طرح نرم اور ملائم بیئر، زندگی کی تلخ حقیقتوں کی طرح کڑوی کسیلی وسکی۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ پی کون رہا ہے، پلا کون رہا ہے، ہنس کون رہا ہے، ہنسا کون رہا ہے۔ ہر طرف قہقہوں کی نقرئی گھنٹیاں، ہر سمت نگاہوں کے سنہری جال، ساون کی اُمڈتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح کھلے بال، خوشبوؤں کے لپٹے، شراب کے بھبکے، اداؤں کے جال، لہر در لہر، موج در موج۔ حسن میں جرأت ہی جرأت، ہمت ہی ہمت، نہ زاہدانِ خشک کا ڈر نہ شرع و آئین کا خوف۔ ہر فیصلہ ایک نگاہ میں۔ اتنی برہنہ فحاشی اس قدر خودسر عیاشی، یہاں آدمی کس قدر آزاد ہے۔ یہاں آدمی کس قدر مجبور ہے۔ انسان جی رہا ہے۔ انسانیت دم توڑ رہی ہے۔

پتایا کے متعلق ہم اور بھی بہت کچھ لکھ سکتے تھے اگر ہم نے ان شاء اللہ خان کا وہ تبصرہ نہ پڑھا ہوتا جو انہوں نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان پر کیا تھا۔ ایک ذرا سے چھپر کٹ کے سین پر انہوں نے جو طوفان اُٹھایا تھا وہ یقیناً پتایا کی بیک گراؤنڈ میں بادلطیف ہی نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نقل کفر، کفر نہ باشد لیکن یہی نقل ذرا عقل کے ساتھ کی جائے تو کمزور طبیعت انسان تشنہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کر سکتا ہے۔ اور ویسے بھی ہم اس گناہ کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے جسے ہم نے بڑی مشکل ہمت اور حوصلہ سے وہاں سرزد ہونے سے روکے رکھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ عمل دخل ہماری جیب کو بھی ہو لیکن اتنے بڑے ثواب کا کریڈٹ ہم صرف مجبوری حالات کو نہیں دے سکتے۔

[جاری ہے۔]

افتخار شوکت

گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
افتخار شوکت کی خیال افروز باتیں

.....

مجھے بے حد خوشی ہے کہ افتخار شوکت عنفوان شباب سے ہی زندگی کے معاملات اور اس کے مختلف النوع خیالات پر گہری گرفت اور معاملہ فہمی کے کمالات سے بہرہ مند رہے ہیں۔ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں میری ادارت میں چھپنے والے کالج گزٹ اور میگزین ساہیوال میں ہمیشہ ان کی صحت مندانہ سرگرمیوں کی سرگزشت شائع ہوتی رہتی تھی۔ وہ نئی سے نئی باتیں سوچتے، ایک عام کالج کے روزنامچہ کو مفید اور کارگر مشوروں سے گراں قدر بنانے کا فکر انہیں لاحق رہتا تھا۔ ان کے والد گرامی خود نامی گرامی ادیب اور تعلیمی معاملات میں طلبہ کی قرار واقعی دلجوئی کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔

افتخار شوکت نے والد گرامی کی متانت، علم دوستی اور ادب پروری سے بڑا فیض پایا۔ میں ہمیشہ ان کا مداح رہا اور ان کی

سید ریاض حسین زیدی

تحریروں میں خوبیاں اور کمالات ڈھونڈنے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ سو خوبیوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت مودب اور ساتذہ کی دلی تکریم سے مالا مال تھے۔ بحرحال کالج سے فارغ ہونے کے بعد بھی انہوں نے اپنی ادبی کاوشوں کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا۔

افتخار شوکت کے روزنامہ دنیا میں نہایت گراں قدر مضامین شائع ہوتے رہے۔ پھر ان کی شاعری کی خداداد صلاحیت کسی مقام پر ماند نہ پڑی۔ پہلے مشاہیر اساتذہ کا انتخاب ان کی نگاہ میں معتبر ٹھہرا۔ یہ انتخاب ہر لحاظ سے سراہا گیا۔ پھر ان کے شعری مجموعے کی اشاعت میں نہایت عجلت دیکھی گئی اور اہل نظر نے ان کے شعری اعجازات کو سراہا۔ ہمارے مشترک دوست اور عزیز جناب علی رضا نے تو ان کی زندگی کے کوائف پر دوست احباب سے ڈھنگ کے مضامین بھی لکھوانے شروع کیے۔

اس وقت ان کی کتاب "خیالات" کا مجموعہ میرے پیش نظر ہے۔ یہ تحریریں، تبصرے، مشاہدے اور مختلف النوع حالات و واقعات ہیں جو افتخار شوکت کی ذہین فکر نے مناسب اور متناسب الفاظ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کم و بیش ستائش مضامین کا یہ مجموعہ کسی طرح بھی سرسری اور محض مبالغہ آرائی اور گپ شپ کے ذیل میں نہیں آتا۔ میں نے اس کی ایک ایک سطر دل کی گہرائیوں سے پڑھی ہے اور حیرت ہے کہ شوکت کے ذوق تجسس نے ہر مقام پر معرکہ آرائی کی ہے۔ "مشتاق یوسفی" دلوں میں زندہ رہیں گے "ایک زندہ و پائندہ تحریر ہے، جو جناب یوسفی کے کمالات کل کی خاصی ترجمانی کرتی ہے۔ اسی طرح ابن انشا پر ان کی تحریر نہایت متحمل اور معتدل افکار کی آماجگاہ ہے۔ آپا بانو قدسیہ، مرزا غالب اور بالآخر متروک کراچی سرکل ریلوے کے ساتھ ایک سفر نہایت طبع زاد ہے۔ میں زیادہ تفصیلات سے گریز کر رہا ہوں اور خوش ہوں کہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں کسی حد تک میری نگرانی اور میری نگہداشت کا ثمر ضائع نہیں ہوا۔ زندگی رہی تو مزید باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ میں بصد شوق کہوں گا:

شوکت بھی افتخار بھی ہیں وجہ ناز بھی
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

☆☆☆☆☆

یہ اردو کے محسن

اپنے پچاس سال پرانے کاغذات چھانٹتے ہوئے ایسے ایسے جواہر نایاب نکل رہے ہیں کہ جی چاہتا ہے انہیں تعویذ بنا کر رکھوں۔ ان میں کچھ ایسے نام بھی آتے ہیں جو اردو زبان کی خاطر بڑا کام کر گئے ہیں، وہ باقی نہیں مگر ان کے نام ابھی ذہن سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ یہ میرے سامنے خطاء راستہ ہیں: پروفیسر گیان چند جین۔ کالی داس گپتا رِضا۔ ا ± پندر ناتھ اشک اور افسانے میں حقیقت کی روح پھونکنے والے محترم رام لعل۔ یہ سب میرے ہمدم تھے۔ جگن ناتھ آزاد کے ہاتھ کا کوئی خط نہیں نکلا مگر وہ دل سے بہت قریب تھے، اسی طرح پروفیسر گوپی چند نارنگ کی رفاقت نصیب ہوئی اور خوب ہوئی۔

کالی داس گپتا رضا کا لندن آنا مجھے خوب یاد ہے۔ باکمال انسان تھے۔ غالب کے ایسے مداح کم ہوں گے۔ صحیح معنوں میں محقق تھے۔ مرزا غالب کے ایک ایک شعر کی چھان پھٹک کی اور یہ معلوم کیا کہ انہوں نے کون سی غزل یا نظم کب اور کن تاریخوں میں لکھی۔ اس کے بعد انہوں نے غالب کا سارا کلام سلسلہ وار ترتیب دے کر شائع کیا جو حیرت انگیز تحقیق ہے۔ ان کے اس والہانہ انداز پر حکومت ہند نے انہیں بڑے بڑے اعزاز عطا کیے۔ ہندی زبان سے وابستہ ادارے انہیں دعوت دیا کرتے تھے کہ ہمارے ہاں آ کر لیکچر دیجئے اور ہمیں غالب کا کلام سمجھایئے۔ خوشی خوشی جاتے تھے۔ بہت کم لوگ یقین کریں گے کہ کالی داس گپتا رِضا ساہوکارہ کرتے تھے۔ قرض پر پیسے چلاتے تھے۔ اس کاروبار میں ان سے زیادہ ان کی فیاضی کو شہرت حاصل تھی۔ بہت سے ضرورت مندوں کا انہوں نے ہاتھ تھاما۔ ان کا فروری سنہ دو ہزار ایک کا خط یہاں نقل کر رہا ہوں:

محبِ مکرم تسلیم! آپ کا کرم نامہ موصول ہوئے مدّت ہوگئی۔ مکروہاتِ زمانہ نے فرصت نہ دی۔ اب کچھ فراغت ہوئی ہے تو

رضا علی عابدی

جواب لکھ رہا ہوں۔ امریکہ میں آپ کے کامیاب سفر پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔ میری کتابیں بہت ہیں، ساٹھ سے زیادہ۔ ان میں سے چند ضروری (میرے خیال سے) جلد آپ کی نذر کردوں گا۔ کوئی آنے جانے والا مل گیا تو کیا ہی کہنا ورنہ ڈاک سے بھیج دوں گا۔ آپ کے ساتھ ملاقات سیر حاصل نہ رہی مگر جتنی رہی خوب رہی۔ جناب جاوید شیخ صاحب کے گھر میں بڑی رونق رہی۔ انہوں نے اور ان کی بیگم اور بچی نے میزبانی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ان کے اس جملے نے کہ "ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غالب خود چل کر ان کے گھر آ گئے ہیں" آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں تو اردو زبان و ادب کا ایک ادنیٰ سا خادم ہوں۔ اردو والے جہاں بھی ہوں خوش رہیں۔ سب کو میرا غائبانہ ہی سہی، آداب۔ ساوتری اور میری طرف سے بیگم عابدی کو سلام عرض کریں۔

پسِ نوشت: ضعفِ عمر اور ضعفِ بینائی دونوں سد راہ ہیں اس لئے میری تحریر کی غلطیوں کو معاف فرمائیں

مخلص کالی داس گپتا رضا۔

یہ انکساری اب ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ بہت یاد رہیں گے۔ ملتان کے غالب پرست لطیف الزماں خاں سے گہرے مراسم تھے جو ان سے ملنے بمبئی جانا چاہتے تھے، نہ جا سکے۔ رضا تخلص کرتے تھے اور رضا کے نیچے زیر لگاتے تھے۔

میرے ہاتھ لگنے والا دوسرا خط اردو زبان اور قدیم ادب کے بڑے استاد پروفیسر گیان چند جین کا ہے جو انہوں نے زندگی میں پہلا غیر ملکی سفر شروع کرنے سے پہلے حیدرآباد دکن سے مجھے لکھا تھا۔ خالص تحقیق کے آدمی تھے اور زبان و ادب میں بڑا نام کر گئے۔ ریاست رام پور کے عروج کے دنوں میں وہاں کے قصہ گویوں کے کہے ہوئے قصے تحریری شکل میں انہوں نے ہی دریافت کئے اور قدیم ادب کی روایات پر خوب کام کیا۔ لندن آئے تو ان کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ میرے پروگرام شوق سے سنتے تھے اس لئے میری خوب رہنمائی کی۔ ایسے سادہ مزاج کے شفیق بزرگ تھے کہ یہ قیاس کرنا بھی مشکل تھا کہ شعر و ادب کی رگ رگ سے واقف ہوں گے۔ اردو اور ہندی کے تعلق سے ان کا اپنا نظریہ تھا جس پر خوب خوب بحث چھڑی۔ شکر ہے زمانے نے ان کی

قدر کی اور ان کی علمی کتب یقین ہے کہ زندہ رہیں گی۔ ان کا تقریباً چالیس سال پرانا خط یہاں نقل کر رہا ہوں۔

شعبہ اردو - یونیورسٹی آف حیدر آباد
9فروری83ء

محب مکرم تسلیم، آج کی ڈاک سے آپ کے عطا کردہ 83 کے دو کلینڈر ملے۔ بہترین طباعت اور کتابت اور ان سب پر مستزاد یہ کہ کلینڈر کا ہر ہر لفظ آپ کی نگاہِ الفت میں بسا ہوا تھا۔ کیونکر شکریہ ادا کروں کہ آپ ہر موقع پر مجھ کم زور کو یاد رکھتے ہیں۔ کتب خانے کا پروگرام کبھی کبھی سن لیتا ہوں۔ آپ نے کتب خانہء آصفیہ، حیدر آباد اور مہا راجہ صاحب محمود آباد کی لائبریری کے بارے میں میرے دوست ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی مختصر تقریریں نشر کیں۔ وہ اچھے نقاد ہیں لیکن قدیم کتب سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔ محمود آباد کی لائبریری کے بارے میں انہوں نے دو بار کہا کہ کلام حیدری اس کتب خانے تک رسائی حاصل کر سکے ہیں اور وہاں سے کتابیں لے کر شائع کر چکے ہیں۔ کلام حیدری ایک ترقی پسند ہیں جو رسالہ آہنگ ماہنامہ اور مورچہ ہفتہ وار گیا (بہار) کے ایڈیٹر ہیں۔ نارنگ صاحب کی طرح ان صاحب کو بھی قدیم ادب سے دلچسپی نہیں۔ دراصل محمود آباد تک پہنچنے والے ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری ہیں۔ انہوں نے اور صرف انہوں نے اس کتب خانے تک رسائی حاصل کی۔ ہندوستان کا مرکزی حکومت کا ایک ادارہ ساہتیہ اکیڈمی ہے۔ یہ ہر سال ہند کی ہر زبان (22) میں شائع شدہ بہترین کتاب پر پانچ ہزار روپے کا انعام دیتی ہے۔ بعضے سال کسی بھی کتاب کو انعام نہیں ملتا۔ آپ یہ جان کر حیران اور خوش ہوں گے کہ 82 کا اردو انعام میری کتاب 'ذکر و فکر' کو دیا گیا ہے۔

میں ابھی تک کبھی ملک کے باہر نہیں گیا۔ اب کے مئی اور جون میں اپنی دختر سے ملنے کے لئے امریکہ کیلیفورنیا جاؤں گا۔ ساتھ میں اہلیہ ہوگی۔ ارادہ ہے کہ 11 مئی کو یہاں سے چلوں۔ ایک دو دن پیرس میں رکوں اور اس کے بعد تین چار دن لندن میں رہوں۔ اس وقت بی بی سی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا بشرطیکہ اس وقت تک زندگی مستعار وفا کرے۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص گیان چند

☆☆☆☆☆

صاحبزادہ تابش کمال کی دینی غیر منقوط نعتیہ شاعری

شعروں میں جمال بھر دیا ہے
تابش نے کمال کر دیا ہے
(احمد ندیم قاسمی)

صاحبزادہ تابش کمال کو روحانیت و شاعری ورثہ میں ملی۔ حصول تعلیم کے بعد والد ماجد پروفیسر باغ حسین کمالؒ (1937-2000) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دکھی انسانیت کی خدمت کے لیے 'دارالکمال' پنوال / چکوال مرکز بنایا۔ اردو پنجابی زبانوں میں خوب شاعری کی۔

جو مجموعہ ہائے کلام منظر عام پر آچکے ہیں۔
منظر منظر دھوپ (1998) + شام پئی بن شام (2007) + مہاجر پرندوں کی نظمیں (2005) + صلی علیٰ (2012) + پیار پیام (2019) + نور مبینؐ (2020)

ان تصانیف کے علاوہ والد گرامی کی رحلت کے بعد تعزیتی تحریروں پر مبنی پروفیسر باغ حسین کمالؒ ''نوح کمال'' فروری 2001 میں شائع کی۔ صاحبزادہ تابش کمال کی شخصیت و ادبی خدمات پر اسرار احمد ادراک کی 8 اپریل 2006 کو معلوماتی کتاب منظر عام پر آئی۔

''صاحبزادہ تابش کمال کو کچھ کمال تو ورثے میں ملا اور کچھ اس نے ذوق خدا داد ریاضت روز و شب سے حاصل کیا۔ پھر خوش نصیبی اُس کی متاع ہُنر کو رفتہ رفتہ حمد و نعت کی طرف لے آیا۔

میری خواہش ہے کہ دربار رسالتؐ میں مجھے شاعر نعت و مناجات سے جانا جائے

.....

''نعت تابش کمال کے نزدیک ایک طرح کی خود کلامی ہے۔ جو وہ صرف ایک ہی ذات گرامی کو سنانا چاہتا ہے اور اُس ذات گرامی کی پہچان وہ، اقوال و روایات سے نہیں، وحی و آیات اور صحابہؓ کے خیالات سے کرنا چاہتا ہے۔''

(ڈاکٹر خورشید رضوی)

آفتاب احمد ملک

صاحب موصوف غزل ونظم کے ساتھ ساتھ نعت نگاری کی طرف قلبی و روحانی طور پر مائل ہیں۔ غیر منقوط شاعری اور وہ بھی نعت گوئی جو مشکل ترین تخلیقی صلاحیتوں کی غماز ہے۔ غیر منقوط صنف میں معدودے چند شعرا نے کمال کے تجربے کیے ہیں۔ بعض اردو پنجابی شاعروں نے غزلیات کے مجموعے اس صنف میں شائع کیے۔ جب سرزمین عرب میں خورشید اسلام طلوع ہوا۔ اُس وقت عام طور پر خط کوفی ہی رائج تھا۔ آنحضرت رسولؐ مقبول نے مختلف شہنشاہوں اور سرداروں کے نام تحریری خطوط اور کتابت وحی قرآن سے ابتدائی نمونے خط کوفی ہی میں ملتے ہیں۔ ابتدا میں خط عربی میں نقطوں اور اعراب کا طریقہ نہیں تھا۔ جب دین اسلام وسعت پزیر ہوا اور اس کا دائرہ وسیع ہوتا ہوا مصر اور ایران تک پھیلا تو اکثر عجمیوں کے لیے سمجھنے میں دشواری پیش آئی۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان (ھ705 - ھ685) نے عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کو رسم الخط کی اصلاح کا حکم دیا۔ اس کام کے لیے نصر بن عاصم کو مقرر کیا۔ مشکل الفاظ، حروف کی تخصیص کے لیے اُس نے نقطے ایجاد کیے۔ لیکن ان نقطوں کے لیے سیاہ رنگ لازم قرار پایا۔ یہ حالت تقریباً 40 سال تک قائم رہی۔ جبکہ عبدالرحمٰن بن احمد عرضی نے اعراب کی شکل وضع کی ان کو نقطوں سے جُدا کیا۔ خط کوفی سے خط نستعلیق تک کا سفر صدیوں پر محیط ہے۔ علم بیان کا انحصار تشبیہ، استعارہ کنایہ اور مجاز مرسل پر ہوتا ہے۔ تخلیق کار اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی بات کو مختلف طریقوں سے بیان کر سکے۔ ضائع لفظی و ضائع معنوی دو صنعتیں ہیں۔ ضائع لفظی سے شاعری میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صنعت کو صنعت 'غیر منقوط' کہا جاتا ہے۔ (ماہنامہ شام وسحر، لاہور جنوری 2004 صفحہ نمبر 35) غیر منقوط میں عربی زبان میں دو کتابیں سواطع الالہام اور مواد الکلم ملتی ہیں۔ دربار اکبر کے ابوالفیض فیضی کی تحریر کردہ ہیں۔ ابو قاسم حریری کی غیر منقوط تحریریں درس نظامی میں شامل ہیں۔ محمد صدیق لاہوری نے غیر منقوط 'سیرت النبیؐ' لکھی جو ناپید ہے۔

سید انشاءاللہ انشا پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم اور نثر دونوں میں اپنی مہارت کے جوہر دکھائے۔ اردو شاعری میں ایک دیوان بے نقط ہے۔ 100 اشعار پر مشتمل ایک فارسی مثنوی اور 55 اشعار پر مبنی 'منقبت مقیدہ الطور' ہے۔ جس میں عربی فارسی ترکی اور اردو کے اشعار شامل ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے نام بھی اسی زمرے میں آتے ہیں خصوصاً غیر منقوط مرثیے لکھے۔ (ماہنامہ فیض السلام، راولپنڈی جون 2001 ص 7)

اردو زبان میں ممتاز عالم دین، ولی محمد رازی (کراچی) نے 408 صفحات پر مشتمل

'ہادیٔ عالمؐ سیرت طیبہ غیر منقوط شائع کی۔ (1982) - رباعی گو شاعر راغب مراد آبادی کی 'مدح رسولؐ' نعتیہ کلام پر مبنی رباعیات (1983) نعت گو شاعر سید مختار گیلانی کا مجموعہ نعت 'محمدؐ' (اگست 1993) شاعر فکر و انقلاب پروفیسر ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ) مجموعہ کلام ملوکیت شکن پیغمبرؐ میں غیر منقوط نعت (1996) شیخوپورہ کے پنجابی کے شاعر گل مختار کا شعری مجموعہ 'اوکڑ اکھراں' (1999) پروفیسر ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری ''سرور شوق'' (جنوری 2001) غیر منقوط ہے۔ بزم ادب و ثقافت کے چیئرمین کی خداداد صلاحیتوں کی داد دی جاتی ہے۔ ''غیر منقوط'' کی وضاحت و تہدی۔ طور لازمی تھیں۔ صاحبزادہ تابش کمال نے کمال حکمت و احترام اپنے نعتیہ مجموعہ کلام ''نور مبین'' کے صفحہ نمبر 211 تا صفحہ نمبر 216 پر 31 اشعار غیر منقوط شامل کیے ہیں جن میں عشق مدنی تاجدار کی جھلک نمایاں ہے۔ دیکھیے گا:

اللہ کے دلدار محمدؐ کملی والے
مرے لیے سرکار محمدؐ کملی والے

.....

ہر دم دعا صلّ علیٰ
''وکھری'' عطا صلّ علیٰ

.....

ہمارے دہر کا احساس اک رسولؐ اللہ
ہمارے واسطے الماس اک رسولؐ اللہ
اللہ کے ہمدم، مرے سرکارؐ دوعالم
وہ دہر کے محرم، میرے سرکارؐ دو عالم

.....

صاحبزادہ جی کی غیر منقوط نعت نگاری نے عمومی قارئین شعر و ادب کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ 'آپ اپنے والد اور شیخ حضرت باغ حسین کمال کے قائم کردہ 'سلسلہ اولیہ کمالیہ' کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ سماجیات سے کنارہ کش ہو کر پنڈی روڈ، چکوال پر قائم کردہ اپنی درگاہ 'دارالکمال' میں سالکین کے دلوں میں عشق الٰہی اور حبِ رسولؐ کی شمع فروزاں کرنے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کے روحانی سفر پر مشتمل معرکتہ الاراء تصنیف، سیر الافلاس' نہ صرف تصوف و سلوک میں ایک گرانقدر اضافہ ہے بلہ رواں نثری اسلوب کے حامل ادیب سے بھی متعارف کرواتی ہے۔ یوں ادیب 'اکلاپے کے جنگلوں میں گم شاعر' میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں 'تلاش اور جستجو کے اس روحانی کرب میں شامل ہے اور میں اس کے اس روحانی کرب کے گواہ کے طور پر اس کا یہ شعر اکثر گنگنا تا رہا ہوں:

اُفق کے پار کوئی حد نظر میں رکھے گی
تری تلاش مسلسل سفر میں رکھے گی

''سخن وران چکوال 2017 صفحہ نمبر 48-49''

☆☆☆☆☆

کھنڈر سانسیں اور مضطرب کردار

سات جہتوں کا افسانہ نگار، دو شعری مجموعوں کا خالق، دو تنقیدی تصانیف کا امین، چھ تاریخ و تحقیق کے شاہد سفرناموں کا مسافر، صوفی ازم اور مزارات کی آبلہ پا گرد اور، فنِ تعمیر پر لکھی گئی دو بیش قدر کتابوں کا مصنف اور لاہور جیسے مرکزی ادبی شہر کے منظر ناموں کا بیان کار ڈاکٹر عاقر شہزاد اگر "مکلی میں مرگ" کے عنوان کے ساتھ "ناول" نہ لکھتا تو میں کبھی بھی اس یکتا فہم کشا اور زندگی اور موت کے درمیان پنڈولم کی طرح جھولتے ہوئے فلسفوں کے مجموعے کو فکشن یا ناول قرار نہ دیتا۔

ڈاکٹر اظہار الحق ہاشمی سے منسوب کی گئی اس کتاب کے چوبیس ابواب ہیں جن میں مختلف سماجی حیثیت، علمی استبداد اور ضرورت بیاں کے حامل کرداروں کی نشست و برخاست پر اس ناول کی تعمیر کی گئی ہے۔ "انسان، خدا اور کائنات" جیسے وسیع اور لامتناہی موضوع پر مصنف نے اپنا ابتدائیہ تحریر کیا ہے جسے نہ تو کتاب کا پیش لفظ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی محاکمہ یا خلاصہ۔ اسے ہم اپنی آسانی کے لیے پختہ کار شاعر کی کثیر موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی ایک غزل کا مطلع کہہ سکتے ہیں۔

"مکلی میں مرگ" کا بنیادی کردار ارسلان منصور ہے جو پہلے باب سے آخری تک قاری کے ہمراہ رہتا ہے۔ اس نے فنِ تعمیر کی اعلیٰ تعلیم بیرونِ ملک سے حاصل کی مگر اپنے خوابوں کی تعبیر و تشکیل کیلئے وطنِ عزیز کا قصد کیا۔ اس کی ذات جدت اور قدامت، تصوف اور منطق، فطرت اور ارتقا، حسنِ تخیل اور کربِ آگہی میں سرتاپا مستغرق ہوتی ہے اور وہ ناول کے دیگر کرداروں کے ساتھ حق کی تلاش میں ایک سو اٹھانوے صفحات، گویا ایک سو اٹھانوے قرنوں کی مسافت طے کرتا ہے۔

"مکلی میں مرگ" کا دوسرا کردار صائمہ علی ہے جس کی دادی اس کی انگلی تھامے ماضی کی پرشکوہ تجلیات میں سرگرداں ملتی ہے۔ وہ بی بی پاک کے مزار کے عشق میں مبتلا، سود و زیاں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے طویل جدوجہد کر رہی ہے جبکہ ناول کے دو کردار حافظ عبدالرحمان اور اس کا بیٹا، وارث شاہؒ اور سید علی ہجویریؒ کے درمیان حائل مہین فرق کو تمام عمر نہ سمجھتے ہوئے جنڈیالہ شیر خان میں وارث شاہؒ کے مزار پر مسجد کی تعمیر کے خواہش مند ہیں۔ مزاروں پر روایتی انداز میں گھسٹتی بہلتی زندگی گزارتا ہوا ایک کردار عبدالحمید بھی ہے جس کی بیٹی صائمہ علی کی دوست ہے۔ یہ اور اس جیسے چند کردار بی بی پاک کے مزار پر کھیلا

ناصر ملک

جانے والے روایتی فرقہ وارانہ کھیل کو آشکار کرنے کیلئے تشکیل دیے گئے ہیں۔

"مکلی میں مرگ" کا میری دانست میں سب سے مضبوط اور جاندار کردار بابا مستان کا ہے جو مزار مزار گھومتا ہے، کچھ تلاش کرتا ہے، کچھ متلاشیوں کو عنایت کرتا ہے اور اپنی دنیا میں گم رہتا ہے۔ اسے پاکستان کے بیسیوں درباروں سے واقفیت ہے۔ وہ طارق اسماعیل کی صحافتی آبیاری کرتا ہے۔ طارق اسماعیل بنیادی طور پر ماہر تعمیرات ہے مگر صحافت کے کل وقتی پیشے سے منسلک ہے۔ وہ بابا مستان کی اشارہ کنائی میں درباروں سے ملحقہ کہانیاں بطور فیچر سٹوریز کرید کر اپنے اخبار کی زینت بناتا ہے۔

اُچ شریف کی ٹوٹتی ہوئی حفاظتی دیوار ہو، بی بی پاک کے مزار کا شناختی بحران ہو، وارث شاہ کے علمی اور فنی تشخص کا تعین ہو، مادر ملت کی طرف سے مزار قائد کا ٹھکرایا گیا تعمیراتی ماڈل ہو، مکلی کے قبرستان میں بننے والے بانسوں کے زیرو کاربن آڈیٹوریم میں آئیو وانڈرچ کے ناول "درینہ کا پل" کے ہیرو ریڈی صاف کا آخری مقالہ ہو یا اوقاف، عدلیہ اور انتظامیہ کی مجبور پالیسیوں کے کمزور احوال ہوں، مکالموں کی برجستہ ادائیگی، معلومات کی سہل تر ترسیل، لحہ بہ لحہ آگے بڑھتی ہوئی کہانی کی دلچسپی کو قائم رکھتے ہیں۔

اس ناول میں چند ایک ابواب ایسے بھی ہیں جن میں مصنف نے وہ تحریر کیا ہے جو بوجوہ کسی کردار کے ذریعے نہیں کہہ پایا۔ یہ زندگی اور موت کے باہمی تعلق، کھنڈرات، ارتقا، ضروریات اور پردہ داریوں کے فلسفوں کی غلام گردشیں ہیں۔ ایک متجسس قلم کار کی طرح وہ رد و تائید کے قائل بھی معلوم ہوتا ہے اور دلیل و منطق کا شہ سوار بھی۔

"مکلی میں مرگ" کا آغاز روایتی ہے اور فی زمانہ رائج فلیش بیک کی تکنیک کا سہارا نہیں لیا گیا۔ انجام چونکا دینے والا نہیں ہے مگر بہت کچھ سوچنے کی دعوت اور کیا کھویا اور کیا پایا کا تعین کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

اس ناول میں کہانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ ماہرانہ دستاویزی انداز میں ٹھٹھہ میں واقع مکلی کے قبرستان میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس برائے تعمیرات کے احوال کے ساتھ ساتھ بی بی پاکؒ، بابا فریدؒ، سلطان باہوؒ، عبداللہ شاہ غازیؒ، سرخ پوش بخاریؒ، شاہ حسینؒ، بابا عنایت قادریؒ، بلھا شاہؒ، وارث شاہؒ، علی ہجویریؒ، پیر مکی شریفؒ، کی درگاہوں اور مقابر کی ماضی پوش عمارات کا اجمالی اور تفصیلی احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔

اسے رواداری میں آسمان کتاب قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہ رومانوی، سماجی، معاشرتی اور طبقاتی تقسیم پر لکھا گیا ناول نہیں ہے۔ اس میں عشق و سرمستی، ہجر و وصال اور مجازی بھول بھلیاں نہیں ہیں۔ یہ فنِ تعمیرات کے مختلف پہلوؤں پر ماہرِ فنِ تعمیر ناول نگار کا تحقیقی بیان ہے جو عام قاری کے لیے زود ہضم نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

شِبہ طراز ---------- افسانے کی نئی جہت

بہت زیادہ پیچھے جائے بغیر بات کرتے ہوئے اگر بیسویں صدی کے دوران ادب کی دنیا میں افسانے کے مقام کا ذکر کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ وہ دن تھے جب افسانے نے اپنی روایتی جہت کے ساتھ علامتی جہت بھی اختیار کی - یہاں ان دونوں جہتوں کے درمیان کسی قسم کا موازنہ کرنا مقصود نہیں بلکہ آگے بڑھتے ہوئے حالیہ یعنی اکیسویں صدی میں افسانے کے مقام کا تعین کرنا ہے۔ اس صدی کے آغاز ہی سے عوامی سطح پر مروجہ اصلاح انفارمیشن ٹیکنالوجی نے فاصلوں اور وقت کو اس حد تک سمیٹ دیا کہ قوموں کی تقدیر بدلنے سے لے کر ایک عام آدمی کی ذاتی زندگی تک میں دخل اندازی چند بٹنوں کے دائرہ اختیار میں آ گئی۔ اکیسویں صدی ہی کے ابتدائی سالوں کے درمیان ادبی دنیا میں اپنی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے شِبہ طراز نے اس بٹنوں کے اثر کو محسوس کیا اور ان کا تعلق افسانے کی دنیا سے جوڑنے کی کوشش کی اور یوں ادب کی دنیا میں انہوں نے افسانے کو ایک نئی جہت دی۔ اس نئی جہت کو عنوان دینے کا ذمہ میں ادب کے سرخیلوں پر چھوڑتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھاتا ہوں۔

مشرقیت اور جدیدیت، ادبی حوالے سے دو ایسی اصلاحات ہیں جو ایک دوسرے کا متضاد محسوس ہوتی ہیں۔ مگر شِبہ طراز کے افسانوں میں ہمیں مشرقیت اور جمہوریت ایک دوسرے کے ہم رکاب دکھائی دیتی ہیں۔ اپنے افسانے ''درد کالمس'' میں فورتھ

عامر رضوی

ڈائمنشن اور ٹائم مشین کا ذکر کرتے ہوئے وہ سوال اٹھاتی ہیں کہ کیا انسان کا ماضی میں جانا ممکن ہے۔ مگر اسی کہانی میں ان کا ایک کردار مجبوری کا احساس دلاتا ہے کہ اگر کسی طور ایسا ممکن ہو بھی جائے تو بھی وہ انسان نتائج پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یہ ہے وہ جدیدیت جس کا شبہ بھرپور ادارک رکھتی ہیں۔ مگر وہ جدیدیت سے مرعوب نہیں ہوتیں بلکہ مشرقی اقدار کا فخریہ انداز میں دفاع کرتی ہیں۔ چنانچہ اپنے افسانے ''پوری زندگی آدھا خواب'' میں جب ایک خاتون اپنے شریک حیات کو بذات خود رشتے کے تقدس کو مکمل طور پامال کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو شبہ طراز مشرقیت کے تقدس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس منظر میں کسی قسم کے تلذذ کا شائبہ تک ابھرنے نہیں دیتیں۔ بلکہ وہ اپنی پُر اعتماد تحریر کے ذریعے اس منظر کو صرف ایک فقرے کے زور پر یوں پیش کرتی ہیں کہ قاری اس فعل سے نفرت محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ فقرہ کچھ یوں ہے۔۔ ''اور اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔۔۔ اسی کے گھر۔۔۔ اس ہی کے بستر پر۔۔۔ وہ سب کچھ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔۔۔ رشتوں کے تقدس کی ٹوٹی ہوئی کرچیاں اس کے وجود کو زخمی کر گئی تھیں۔''

یہ بات نہیں کہ اس موضوع پر افسانے نہیں لکھے گئے بلکہ یہ کہ دنیا بھر میں افسانہ زیادہ طور پر اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ تاہم شبہ طراز کا کمال یہ ہے کہ جہاں دیگر لکھاریوں نے اس موضوع پر اوراق کے اوراق خرچ کیے ہیں، وہ کل پانچ صفحوں کے افسانوں میں سے بھی صرف دو تین فقروں کے استعمال سے افسانے کا اپنی مرضی کے مطابق تاثر قاری کے ذہن تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئیں۔

شبہ طراز نے اپنے افسانوں میں انوکھے تجربات کے خطرات بھی مول لیے ہیں۔ سامنے کی بات یہ ہے کہ وہ اس عمل میں کامیاب دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''گیلی ریت'' کل دو کرداروں پر مشتمل ایک ہی کہانی دو مرتبہ بیان کی گئی ہے۔ وہ یوں کہ دونوں کردار اپنے اپنے زاویۂ نظر سے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعہ کو الف سے ے تک بیان کرتے ہیں۔ یوں یہ کہانی قاری کے ذہن پہ دو مختلف قسم کے تاثرات چھوڑتی ہے۔ اس کے بعد ''ملاقاتی'' عنوان کے تحت لکھی گئی کہانی میں شبہ طراز اپنے قاری کی سادہ لوحی کی تفریح لیتے نظر آتی ہیں۔ کہانی کے ابتدائی حصے میں وہ بیان کرتی ہیں کہ کبھی کبھی کسی کہانی کار کا اپنے ہی تخلیق کیئے ہوئے کردار سے ملاقات کا سننے میں آتا ہے لیکن وہ ''ملاقاتی'' کہانی کے اہم کردار سے بطور

کہانی کار ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتاتی ہیں کہ ان کی ان کے تخلیق کردہ کردار سے ملاقات پہلے ہوئی تھی اور کہانی انہوں نے بعد میں تحریر کی۔ یہاں قاری کا ذہن اسے مزید انوکھی واردات سمجھ کر سراسیمہ ہو جاتا ہے۔ اب اگر اس بات کو کہانی کے پہلے بیان کی گئی باتوں سے الگ کر کے سوچیے تو یہ ہرگز انوکھی نہیں بلکہ انتہائی نارمل بات ہے۔ کیونکہ کہانیاں عام طور پر اسی بنیاد پر تحریر کی جاتی ہیں۔ مگر شبہ ہیں کہ قاری کو کچھ دیر کے لیے سراسیمگی کی حد تک حیران کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔

شبہ طراز کی سب ہی کہانیاں قاری کے لیے ایک نیا اور انوکھا تاثر لیے ہوئے ہیں، مگر وہ ایک دوسرے سے مکمل طور پر مختلف ہیں۔ اب ذرا ان کی کہانی ''تجرید'' کو دیکھیے۔ اس کہانی کی راوی خود وہ پینٹنگ ہے جو ایک آرٹسٹ لڑکی بنا رہی ہے۔ اس میں اپنی ایک ہم زاد کو عریاں پینٹ کرتے ہوئے اور ایک مرد کو اس سے تلذذ حاصل کرتے ہوئے دکھانے کے دوران خود آرٹسٹ کے دل پہ جو گزرتی ہے وہ اس کہانی کا موضوع سخن ہے۔ کہانی کو پینٹنگ کی سبجیکٹ لڑکی کا بیان کرنا اور پھر پینٹنگ سے بغاوت کرتے ہوئے فرار ہو جانا قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

لیکن ایک بات اور وہ یہ کہ ان کی کہانی ''محبت کی نبض'' پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شبہ اپنے دل کی بات کسی دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھ کر کہنا چاہتی ہیں۔ شاید وہ خود کا سامنا کرنے سے کتراتی ہیں۔ وہ ایک نسلی اور پیدائشی طور پر فنکار ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اطراف میں ان کی تصوراتی دنیا مضبوط بنیادوں پر موجود ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''کرچیاں'' میں وہ زمانے کو مجسم شکل میں دیکھتی اور محسوس کرتی ہیں، اور ''بٹن سے باہر کی کہانی'' میں وہ چاروں سہیلیوں کو ایک دوسرے سے مختلف بیان کرتے ہوئے چار موسموں کی طرح بیان کرتی ہیں۔ اور پھر جغرافیائی چار سمتوں کی طرح۔ اس کے بعد وہ اپنی کہانی ''دبے پاؤں'' میں خوف کو ایک مجسم شکل میں پیش کرتی ہیں۔ یہ دراصل خوف کی نفسیات پر مبنی کہانی ہے۔ اس میں وہ بتاتی ہیں کہ انسان خواہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو جائے مگر اس کے لاشعور میں چھپا خوف بالآخر ایک خوفناک شکل میں سامنے آ کر اسے پچھاڑ کر دم لیتا ہے۔

شبہ طراز افسانے کو نئی جہت دیتے وقت بہرحال تحریک نسواں یا Feminist Movement میں اپنا کردار ادا کرنا نہیں بھولیں۔ یہاں تک کہ ان کے افسانوں میں Feminism کی چھاپ واضح نظر آتی ہے اور یہ کوئی قابل اعتراض

بات بھی نہیں۔ دنیا کے جس خطے میں وہ سانس لے رہی ہیں وہاں خواتین کے بنیادی حقوق کی پامالی ایک Norm کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایک حساس افسانہ نگار ہونے کی حیثیت سے وہ اس Norm کے خلاف آواز اٹھائے بناء نہیں رہ سکتیں۔ تاہم ایمانداری کی بات یہ ہے کہ وہ خانگی بنیادوں اور دیگر دوسری بنیادوں پر وہ خواتین کی ایک دوسرے کے خلاف حاسدانہ رویے کو موضوعِ سخن بنانے سے بھی نہیں چوکتیں۔ ان کا افسانہ ''بے زبان'' ایک عورت کی ہمکلامی کی ایسی کہانی ہے جس میں ایک ساس اپنی بہوؤں کے معاندانہ سلوک کا دفتر کھولے بیٹھی ہے۔ شبہ کیسویں صدی کی نمائندہ کہانی گو ہوتے ہوئے بسا اوقات اپنے قاری کو مستقبل کی سیر بھی کروا دیتی ہیں۔ ''بیس سال بعد کی کہانی'' مستقبل میں لکھے جانے والے افسانوں کا ایک نمائندہ افسانہ ہے۔ اس افسانے میں ایک انتباہ کا پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ انتہا پسندی کا بڑھتا ہوا رویہ انسان کو ایسے مستقبل سے بھی دوچار کر سکتا ہے جو درندگی سے بھی زیادہ کریہہ الصورت ہوگا۔ انسانیت کے بنیادی دکھوں کو ضبطِ تحریر میں لا کر ''بس حیرانی میں یہ واضح کرنا چاہتی ہیں کہ کس طرح دنیا کے طاقتور ممالک کمزور ممالک کا استحصال جاری رکھے ہوئے ہیں۔ طاقتور کے سامنے کمزور کو جھکنے پر مجبور ہوتے ہوئے مجبور کرنے تک محدود رہتا تو بھی غنیمت تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی کہانی ''انوکھا'' میں طاقتور کے ہاتھوں کمزور کو اس حد تک ذلت اٹھانا پڑتی ہے کہ پورے شہر کے افلاس زدہ لوگوں کی دیکھا دیکھی کہانی کا مرکزی کردار اپنی بیوی سمیت جوکر بن جانے کی خواہش رکھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اور اس کی بیوی جوکر کا حلیہ اپنا سکتے ان کے ہاں جو بچہ پیدا ہوتا ہے وہ پیدائشی طور پر جوکر کے نقوش لیئے ہوتا ہے۔ محض چار پانچ صفحات پر مشتمل افسانہ ''انوکھا'' دوہرا معیار رکھنے والے ہمارے معاشرے کے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ ہے۔

شبہ طراز کی کہانیوں، خاص طور پر ان کی کہانی ''بھید بھرا---'' سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک قلبی سکون کی تہ تک پہنچنے کا راز کیا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ جسمانی آرزؤں کی نسبت روحانی قدروں پہ یقین رکھتی ہیں۔ اور پھر ''وہ ایک رات'' افسانے میں آئیڈیل زندگی کا احوال بیان کرتی ہیں۔ جس میں مرد و عورت کی محبت ہوس سے بالاتر ہے۔ اس کہانی میں وہ نئے آدم و حوا سے ایسی زندگی کو وجود دینا چاہتی ہیں جہاں عورت کے خواب اپنی تعبیر کو پا لیتے ہیں۔ افسانے کے اختتام پہ وہ یہ لکھ کر قاری کو چونکا دیتی ہیں کہ یہ نئے آدم و حوا کی

کہانی نہیں بلکہ شاید کرۂ ارض کے آخری دو انسانوں کی کہانی ہے۔

اکیسویں صدی کے جدید ترین تصورات کا ادراک رکھتے ہوئے مستقبل کی کہانیاں سنانے والی شبہ کیا ماضی سے اپنا تعلق توڑے ہوئے ہیں؟ تو قارئین کرام! اس کا جواب بہت بڑی نہیں نہیں میں ہے۔ ثبوت کے طور پر ان کا افسانہ ''رشتوں کی مہک'' پڑھ لیجئے۔ یہ افسانہ پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ شبہ کس قدر ناسٹلجیا کا شکار ہیں۔ اس افسانے میں وہ خود کو اُس شہر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتی ہیں جہاں ان کے بچپن کے ننھے منے پیروں کے نشان خلط ملط ہیں۔ جہاں ایک چھوٹی سی بچی گاڑیوں سے خالی سڑک پر دیوانہ وار سائیکل چلائے چلی جارہی ہے۔ جہاں چنگ چیوں کے بے ہنگم شور کی بجائے تانگوں کی موسیقیت سے بھری ٹک ٹک کی آوازیں یادوں کی دھمال ڈالنے میں مصروف ہیں۔ جہاں وہ اپنے ہم جولی بچوں کے ہمراہ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے چھپنے کی بہترین جگہیں تلاش کر رہی ہے۔ جہاں وہ چھوٹی سی بچی گلی میں بکنے والا چورن مزے لے لے کر کھا رہی ہے۔

وہ جسے انگریزی میں Brevity کہتے ہیں اور جس کا اردو میں ترجمہ ''اختصار'' ہی ہوسکتا ہے افسانہ نگاری کا ایک بڑا ہنر مانا جاتا ہے۔ Brevity is the soul of wit- یہ ماننا ہے ولیم شیکسپیئر کا اپنے شہرہ آفاق ڈرامے ''ہیملیٹ'' کے ذریعے! تو Brevity یا اختصار شبہ طراز کے افسانوں کا طرہ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے بلاوجہ کی تمہید سے عاری ہوتے ہیں۔ مختصر جملوں سے وہ بڑے بڑے مطالب نکالتے ہوئے اپنے افسانوں کو عام طور پر طور پانچ صفحات میں مکمل کرنے کا ملکہ رکھتی ہیں۔ میں روایتی افسانے کی بات نہیں کرتا۔ روایتی افسانے کا ادب میں اہم اور منفرد مقام ہے اور رہے گا۔ تاہم برق رفتار زندگی کی رفتار میں مسلسل اضافے کی بنا پر شبہ طراز کی طرز کے افسانے کی اب ضرورت آن پڑی ہے۔

جاتے جاتے ایک اور بات کہہ دوں! وہ یہ کہ شبہ طراز کے افسانے پڑھتے ہوئے تاثر ملتا ہے کہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے اور وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں کھل کر کہہ نہیں پاتیں۔ اپنے قلم کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ کوئی خوف ان کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ اور شاید یہ خوف ''لوگ کیا کہیں گے'' کا ہے۔ مگر اب جب کہ ادبی حلقوں میں ان کی ٹھیک سے پہچان ہوچکی ہے انہیں اس خوف کے حصار کو توڑ کر آگے بڑھنا ہوگا۔ اور یہ ان کی ادبی ذمہ داری بھی ہے۔

☆☆☆☆☆

نعت کے شامیانے میں گلوکاروں کی آمد

نعت اپنے موضوع کی یکتائی اور اظہار کے متنوع قرینوں کے حیرت انگیز اور حسین مظاہر کی اپنی الگ تاریخ رکھتی ہے۔اس کا ہر پہلو محبتوں کا لالہ زار اور ہر زاویہ عقیدتوں کی کہکشاں ہے۔ کیوں نہ ہو کہ کائنات میں ظہور پذیر ہونے والی ہر گھڑی" ورفعنا لک ذکرک" کے نئے پرتو کی معجز نمائی لئے ہوئے ہے اور ہر زمانہ عقیدتوں اور محبتوں کے نئے زاویئے روشن کرتا چلا جا رہا ہے ۔یہاں نہ لکھنے والوں کے قلم کی سیاہی خشک ہوتی ہے، نہ پڑھنے والوں کا ترنم پرانا محسوس ہوتا ہے اور نہ سننے والوں کی ساعتیں کسی اکتاہٹ کا شکار ہوتی ہیں ۔ نعت کے حوالے سے آج کل ایک نیا ٹرینڈ تیزی سے مقبول ہو رہا ہے جو کئی حوالوں سے بہت خوش آئند ہے کہ ممتاز سنگرز پرانی پڑھی ہوئی معروف نعتوں کو اپنی آوازوں میں میوزک کے نئے انداز کے ساتھ ری مکس کر کے پڑھ رہے ہیں۔اس میں ایک طرف تو کوئی خاص محنت درکار نہیں، مقبول عام اور زبان زدعام کلاموں کی کانوں میں رچی بسی دھنیں جن سے سننے والے پہلے سے مانوس ہوتے ہیں اور دوسری طرف انہیں نئی آوازوں میں نئے سرے سے جدید آلات پر ریکارڈ کر کے بہتر انداز سے پیش کیا جا رہا ہے۔یہ کلام جس زمانے میں ریکارڈ ہوئے تھے اس وقت نہ تو سوشل میڈیا کی برق رفتاری تھی، نہ ہی ریکارڈنگ کی نت نئی ایجادات کی سہولت اور نہ ہی ان کلاموں کو فلمائے جانے کے آج جیسے بہترین ذرائع موجود تھے۔اس وقت صرف ایک ہی میڈیم تھا جسے مختلف معنوں میں شوق، محنت اور لگن کہتے تھے جس کے ثمرات آج دہائیوں بعد بھی محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ آج میوزک کے حوالے سے شہرت رکھنے والے احباب بہت سے گانے ریکارڈ کرواتے ہیں لیکن ان میں سے بہت مشکل سے ہی کوئی گانا ہٹ ہو کر مقبولیت اور شناخت بنا پاتا ہے لیکن نعت کا اعجاز دیکھئے کہ دہائیوں سے پڑھے جانے والے کلاموں کو جب نئے سرے سے ترتیب

سرور حسین نقشبندی

دیا جا رہا ہے تو یہ تیزی سے سوشل میڈیا پر ہر طرف دیکھے اور سنے جا رہے ہیں۔ نعت کے حوالے سے موجودہ ٹرینڈ نے بہت جلد کامیابی کی منازل طے کی ہیں اور اب موسیقی سے تعلق رکھنے والے بیشتر حضرات اس مبارک تحریک کا حصہ بن رہے ہیں جس سے ایک طرف ان کلاموں اور دھنوں کے بنانے والوں کو نئی زندگی مل رہی ہے اور دوسری طرف نئے لوگوں کو محبت اور پذیرائی سے نوازا جا رہا ہے اور اس کا خوش آئند پہلو میوزک سننے والے بہت بڑے حلقے میں نعت کی آواز کا غیر محسوس طریقے سے سرایت کرنا ہے جسے بہت مثبت پیش رفت کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔

بین الاقوامی سطح پر ایک سرسری نظر ڈالیں تو میوزک انڈسٹری میں ماہر زین اور سمی یوسف اور اس طرح کے دیگر قابل ذکر لوگوں نے نعت کے حوالے سے عالمگیر شہرت پائی اور شاندار ان کی یہی حیرت انگیز کامیابی ہمارے ہاں میوزک سے تعلق رکھنے والوں کو بھی اس طرف مائل کرنے کا سبب بنی۔ میوزک چونکہ پاکستان کی بڑی انڈسٹری ہے، اس پر پیسہ لگانے والے بہت بڑے بڑے ادارے اور لوگ موجود ہیں جن کے ذریعے نعت ایک نئے انداز سے نمو پذیر ہوئی ہے جس نے اس صنف کے حوالے سے کامیابی کا ایک نیا دروازہ کھولا ہے۔ (مرحوم) جنید جمشید نے بھی گلوکاری چھوڑنے کے بعد بہت سی دلآویز نعتیں پڑھیں جو آج بھی زبان زد عام ہیں۔ یقیناً ان کو سننے والی آڈینس نے ان کی نعت خوانی کو بھی بے پناہ پذیرائی بخشی۔ عاطف اسلم موجودہ عہد میں گلوکاری کے حوالے سے بین الاقوامی شناخت اور پہچان رکھتے ہیں۔ صابری برادران کی پہچان بننے والی شہرہ آفاق قوالی "تاجدار حرم" معروف میوزک پروموٹر کمپنی کوک سٹوڈیو اور عاطف اسلم کی سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ سنی جانے والے کلاموں میں سے ایک ہے جسے اسی تناظر میں نئی زندگی ملی۔ اس کے علاوہ انہوں نے مصطفےٰ جان رحمت، اسمائے باری تعالیٰ بھی بہت دلنشین انداز میں پڑھے ہیں۔ حال ہی میں ممتاز سنگر علی ظفر نے بھی "بلغ العلیٰ بکمالہ" کو خوبصورت انداز سے پڑھا ہے جو بہت جلد مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگا ہے۔ استاد رفاقت علی خاں کی پڑھی ہوئی مظفر وارثی مرحوم کی نعت "تو کجا من کجا" جسے مرحوم استاد نصرت فتح علی خاں صاحب نے کمپوز کیا کو ان کی آواز میں بے پناہ محبتوں سے نوازا گیا جس سے رفاقت علی خاں صاحب نے بھی کچھ اور نعتوں کی طرف توجہ کی ہے جن میں "مرا پیمبر عظیم تر ہے" اور حال ہی میں مقبول سلام "اے صبا مصطفےٰ سے کہہ دینا" بھی شامل ہے جسے بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ موسیقی سے تعلق

رکھنے والوں کو بہت دیر سے سہی لیکن بالآخر یہ خیال تو آیا کہ یہ کتنی بڑی پبلک ہے جسے وہ عرصہ دراز سے نظر انداز کر رہے تھے۔ موسیقی سے نعت کے شامیانے میں آنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جنہیں بعد میں اسی حوالے سے جانا اور پہچانا جانے لگا۔ نعت نے اپنے سائے میں آنے والا ایسے لوگوں کو بھی باوقار بنایا جو مسلکی اعتبار سے اس کے قریب نہیں تھے مگر اس کے باوجود انہوں نے عشاق کے دلوں پر راج کیا ہے اور اسی کی برکت سے عزت شہرت اور دولت کمائی۔ یہ پہلو بھی بہت دلچسپ ہے کہ ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو گلوکاری سے نعت خوانی کی طرف آئے اور انہیں بہت عزت بھی ملی اور اعزازات بھی۔ ملکہء ترنم نور جہاں کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ جب بستر علالت پہ تھیں تو انہوں نے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ اب اگر میں صحت یاب ہوئی تو اس گلے سے صرف نبی کی نعت ہی پڑھوں گی۔ برصغیر کے نامور گائیک استاد مہدی حسن اور غلام علی کی آوازیں بھی اس مبارک ذکر سے محروم نہیں رہیں۔ لتا منگیشکر اور محمد رفیع صاحب کی پڑھی ہوئی نعتیں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اس سارے منظر نامے میں ایک بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہے کہ گلوکاری سے شہرت حاصل کرنے والے نعت کے مزاج سے مطابقت رکھنے والی معروف نعتیں پڑھ رہے ہیں اور دوسری طرف نعت کے شعبے سے شہرت حاصل کرنے والے بعض حضرات معروف گانوں پر نعتیں لکھوا کر پڑھنے کی کوشش میں اس مبارک فن کے تقدس کو پامال کر رہے ہیں۔ ان قوالوں پر بھی حیرت ہوتی ہے جو قوالی کے مقدس اور روحانی فن میں نام بنانے کے بعد قوالی نائٹ کے نام پر مستی سے معمور غزلیہ شاعری کو قوالی کے نام پر پڑھنے لگ گئے ہیں جس سے اس فن کی آبرو پر سوال اٹھنے لگے ہیں۔ لیکن بہرحال اس سارے منظر نامے میں یہ حقیقت ان تمام لبرلز، سیکولر اور مغرب نواز میڈیا پر آشکار ہو جانی چاہیے کہ یہ ارض وطن قریہء عشق رسولؐ ہے۔ یہاں کی مٹی رحمت عالم کی محبتوں سے مہک رہی ہے۔ یہاں رہنے والوں کے دل گنبد خضراء کی ہریالی سے ٹھنڈک کشید کرتے ہیں۔ یہاں کے مکینوں کی سانسیں مدینے کی ہواؤں کی خوشبوؤں میں رچی بسی ہیں۔ پاکستانیوں کے جسم رہتے تو یہاں ہیں لیکن ان کی روح مدینے کے درو دیوار سے لپٹی رہتی ہیں اور ان کی آنکھیں روضہ رسولؐ کی جالیوں کے تصور میں گم رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر کوئی نعت کے شامیانے تلے عافیت اور قرار محسوس کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

دوسری عورت

جام سجاد حسین

عورت ایک ایسا لفظ ہے جس کے بنا کائناتِ کل نامکمل تصور کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

....

یوں تو علامہ اقبال کے افکار اور شاعری نے مشرقی معاشروں میں جبر کے خلاف تشدد پسندانہ نظریات کی نہ صرف نفی کی ہے بلکہ بہت ہی منظم انداز میں آگے بڑھنے کی تعلیم دی ہے۔ پاکستان میں علامہ اقبال کو مصورِ پاکستان کے لقب سے نوازا گیا ہے اور یوں وہ قومی شاعر کے روپ میں منظر نامے پر ابھرے ہیں۔ اگرچہ علامہ اقبال نے 'عورت' کے بارے میں بہت ہی کم پرچار کیا ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ عورت کے متعلق رومانوی شاعری کا واضح تصور ہمیں علامہ اقبال کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ کچھ یار لوگوں کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال کی اوائلِ عمری کی شاعری میں عورت کا خاصا عمل دخل تھا بلکہ کچھ تو فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنی اوائل کی شاعری کو اپنی تصانیف میں شامل ہی نہیں کیا ورنہ علامہ اقبال بھی بہت ہی خوبصورت رومانوی شاعر ہوتے تھے۔ ہاں باقی شعراء

کرام بشمول فیض احمد فیض، احمد فراز، میرا جی، احمد ندیم قاسمی، نجیب احمد، خالد احمد، عباس تابش، اعجاز کنور راجہ، اور دیگر ہم عصر شعراء کی شاعری میں عورت کو نہ صرف محور مانا گیا ہے بلکہ تمام شاعری کا دارومدار بھی عورت ہی ہے۔ عورت چونکہ کائنات میں آدھی آبادی ہے اور کائنات میں عورت کے بنا کائنات کا ہی تصور ناممکن ہے اور یہ وہ 'ناممکن' ہے جو کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہوسکتی۔ عورت کے بارے میں مذہبی تصورات بڑے دلچسپ ہیں۔ جیسے کچھ حضرات کا ماننا ہے کہ عورت مرد کی ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور اس کے لئے توجیح یہ دی جاتی ہے کہ عورت چونکہ ہر وقت مرد کے لئے 'مصیبت' کی آمد کا سامان میسر کرتی ہے اس لیے عورت کی ذات کی نفی کرنے کیلئے یہ کہانی بنائی گئی ہے۔ اس خیال کو اس قدر تقویت دی گئی کہ انگریزی میں عورت کے لئے کوئی لفظ ہی تخلیق نہیں کیا گیا ہے بلکہ لفظ Man کے ساتھ دو حروف Wo کا شامل کر کے Woman بنا دیا گیا ہے اور لفظ Wo کی کھوج لگائی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ دراصل Woe ہے جس کا مطلب ہے 'درد سر، مصیبت لانے والی'۔ یعنی عورت کیلئے لفظ ہی ایسا بنایا گیا ہے جس سے عورت کی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ میرا یقین محکم ہے زیادہ تر خواتین کو انگلش لفظ Woman کے بارے میں ان معنوں کا اندازہ ہو جائے تو وہ سب سے بڑا احتجاج مغربی معاشروں میں کریں اور سب سے بڑا 'عورت مارچ' ہمیں مغربی معاشروں میں نظر آئے جہاں پست تصورات کو اس انداز میں تاریخ کا حصہ بنایا گیا ہے کہ عورت کے لئے ایک مکمل لفظ ہی ایجاد نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی تہذیب میں ہمیں عورت کی 'عزت و حرمت' کا وہ معیار نظر نہیں آتا جو ہمیں مشرقی معاشروں خصوصاً اسلام میں نظر آتا ہے۔ اس لئے چاہئے کہ مغربی معاشروں میں بھی عورت کی عزت اور حرمت کے متعلق واضح قوانین وضع کیے جائیں۔ کیونکہ ہمیں اکثر اوقات مغربی معاشروں میں یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ عورت کو آزاد خیال بنایا جاتا ہے، یا آزاد خیال بنانے کیلئے اقدامات اُٹھائے جاتے ہیں جس کا نتیجہ یوں نکلتا ہے کہ عورت ایک ایسی آزادی کے حصول کے پیچھے نکل کھڑی ہوتی ہے کہ خود اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشروں میں عورت اپنی ذات کی نفی محسوس کرنے لگی ہے اور وہ مشرقی معاشروں کی عورت کی طرف دیکھنے لگی ہے، کیونکہ اُسے مشرقی عورت میں اپنی عزت، تکریم، محبت یا چاہت کا وہ نظریہ نظر آتا ہے جہاں عورت کو اپنی راحت محسوس

ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ کائنات میں زمینی سیارے پر مکمل سکون، امن و شانتی کیلئے لازم ہے کہ عورت کو پُرسکون رکھا جائے۔ (اگرچہ یہ بھی ناممکنات میں سے ہے)۔ مگر پھر بھی عورت کی خوشی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔

عورت کے لئے سب سے بڑی مصیبت یا عورت کا دردِ سر کا سامان 'دوسری عورت' کے تصور میں چھپا ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ عورت کو سب سے بڑی تکلیف ہی اس تصور سے ہوتی ہے جب مرد اس کے سامنے دوسری عورت کی بات کرتا ہے یا دوسری عورت لانے کی بات کرتا ہے۔ دوسری عورت کا تصور بھی اپنے اندر آفاقی معنی رکھتا ہے۔ جس طرح 'پیار، محبت، نفرت، بغض' جیسے الفاظ کے معنی دنیا کے کسی بھی کونے، دنیا کی کسی بھی زبان میں وہی ہیں جو ہمارے ملک یا ہماری زبان میں ہیں۔ اس لئے چاہے عورت چاہے جس روپ میں بھی ہو اس کے لئے 'دوسری عورت' کا تصور برداشت نہیں ہوتا۔ اگرچہ مذہبی و معاشرتی رویوں میں 'دوسری عورت' کا تصور کسی حد تک مختلف معنی رکھتا ہے جیسے سعودی عرب خود عورت چاہتی ہے کہ اس کا مرد دو سے تین، تین سے چار شادیاں کرے۔ یہ صرف مذہبی تصور نہیں بلکہ زیادہ تر معاشرتی تصور ہے۔

اگرچہ مذہب اسلام میں ایک سے لے کر چار شادیوں کی اجازت دی گئی ہے مگر جس صورت میں اجازت دی گئی ہے اکثر مرد حضرات اس صورتحال کو سمجھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ وہ دیکھا دیکھی میں دو، دو سے تین، تین سے چار عورتوں کو اپنے نکاح میں لانے کا جتن کرتے ہیں حالانکہ اسلام میں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ سعودی عرب میں معاشرتی زندگی (خالص عربوں کی) اس قدر آسودہ ہے کہ ایک عورت خود چاہتی ہے کہ جس لذت سے وہ لطف اندوز ہو رہی ہے وہ محض حظ اٹھانے کا نام ہی نہیں بلکہ اس کی معاشرتی زندگی اس قدر آسودہ ہو کہ وہ ایک مرد کی ایک ہی طرح کی ضرورت پوری کرنے سے دور رہے۔ اس لئے وہ خود مرد کو اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ وہ چاہتی ہے اور بعض اوقات وہ خود اپنے مرد کی زندگی میں دو، دو سے تین اور تین سے چار بیویاں لانے کے سعی کرتی ہے تاکہ اس کی اپنی زندگی پرسکون رہے۔ چونکہ سعودی عرب میں خالص عربی بے پناہ دولت کے مالک ہیں اس لئے ان کے لئے دو سے تین، تین سے چار عورتوں کے اخراجات پورے کرنے میں دشواری پیش نہیں آتی۔ اس لئے صرف سعودی عرب میں یہ معاشرتی رواج مذہب کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں وگرنہ اسلام میں چار شادیوں کو ازدواجی لذت سے کم معاشرتی زندگی اور معاشرتی

رویوں میں توازن لانے پر زور دیا گیا ہے اس لیے مرد کو اجازت دی گئی ہے کہ دوسری عورت صرف اس صورت میں گھر میں لائے جب دوسری عورت مصیبت کا شکار ہو، بیوہ ہو، یا اس عمر کی ہو جس سے آگے اس کی ازدواجی زندگی محرومی کا شکار ہونے والی ہو۔ اس لئے یہ سمجھنا پڑے گا کہ اسلام میں دوسری عورت کسی بھی صورت میں محض 'لذت' کا سامان میسر کرنے کیلئے ہرگز نہیں ہے۔ اگر حالات کو ذرا بڑے پیمانے پر دیکھا جائے تو ہم بھارت ہی کی مثال لیں جہاں ایک گاؤں میں ایک عورت ایک سے زیادہ مردوں سے ایک ہی وقت میں شادی کر سکتی ہے اور وہ ایک ہی وقت میں کئی مردوں کی بیوی ہوتی ہے مگر یہ مثال پوری دنیا کی خواتین پر لاگو اس لئے نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ صرف اس گاؤں کا معاشرتی رویہ ہے۔ اگر ہم پرانے رومی تہذیب کا جائزہ لیں تو ہمیں عورت کا ایک مختلف روپ نظر آتا ہے جہاں عورت شادی کے بندھن سے آزاد تھی اور وہ میلوں ٹھیلوں پر جا کر اپنی لذت کا سامان خود تلاش کرتی تھی اور مرد اس کی مدح سرائی کرتے تھے۔ تب شادی کا تصور نہیں ہوا کرتا تھا بلکہ عورت اور مرد کے درمیان بندھن کو کسی قانونی و تہذیبی رویے میں قید نہیں کیا گیا تھا لیکن یہ بھی رومی تہذیب کی خوبی ہے کہ سب سے پہلے مرد اور عورت کے درمیان شادی کا تصور بھی اسی تہذیب نے دیا اور باقاعدہ طور پر عورت اور مرد کے درمیان ایک معاہدہ طے کیا گیا جسے بعد میں شادی کا نام دیا گیا۔ یہی وہ تصور ہے جو ہمیں بعد کی تہذیبوں اور مذاہب میں بھی نظر آتا ہے۔ وگرنہ یہ خالصتاً ایک معاشرتی رویے کا نام تھا۔ اب جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہاں دوسری عورت کا تصور ایک قبیح فعل تصور کیا جاتا ہے اور جو مرد دوسری عورت کا ذکر بھی کرے تو پہلی عورت یا پہلی بیوی اسے اپنے لئے ایک خطرہ محسوس کرتی ہے۔ عورت کی ساری محبت مرد کی مکمل ذات میں پنہاں ہوتی ہے۔ عورت یہ سمجھتی ہے کہ وہ جس مرد کیلئے اپنے آپ کو حاضر کر دیتی ہے اور اسے اپنا آپ سر سے پاؤں تک سونپ دیتی ہے وہ چاہتی بھی یہی ہے کہ مرد بھی اپنی محبت کا محور اسی کو رکھے اور اس کے علاوہ کسی دوسری عورت یا کسی اور عورت کا تصور بھی اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے۔ اگرچہ یہ تصور بذات خود محبت کی ایک اعلیٰ مثال ہے جو سمجھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کے اس روپ کو محبت کے انداز میں سمجھنے کی کوشش کرے۔ میرا یقین ہے کہ عورت کے لئے دوسری عورت کے تصور کو اگر مرد کلی طور پر سمجھ لے تو وہ دوسری عورت بارے نہ سوچے، کیونکہ ہر دوسری عورت بھی پہلی ہی عورت کی طرح سوچتی ہے، وہ بھی

کبھی نہیں چاہتی کہ جس مرد کی زندگی میں وہ آجائے تو مرد پہلی عورت میں کھویا رہے۔ اس لیے ہر دوسری عورت بھی پہلی عورت ہی بننا چاہتی ہے۔ جب کہانی کا دارومدار ہی پہلی عورت ہے تو پہلی عورت ہی کیوں نہ ہو؟ یہ ایک ایسا نفیس تصور ہے جو سمجھے کے قابل ہے۔ بلاشبہ ہم اس زمینی سیارے پر پر امن زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ یہ کس قدر اذیت دہ خیال ہے کہ ہم اپنی معاشرتی زندگی میں ہی الجھے رہیں اور اس وسیع و عریض کائنات میں پنہاں رازوں سے پردہ اٹھانے کے لئے جتن ہی نہ کریں بلکہ اپنی معاشرتی زندگی میں کھوئے رہیں۔ یوں تو انسانوں اور جانوروں کی زندگی کے موازنے میں بھی انسان پیچھے رہ جائیں کیونکہ جنگل کا قانون بہرحال انسانوں کے قانون سے کہیں بہتر ہے۔ جنگل میں جب شیر شکار کرتا ہے تو پیٹ بھرنے پر وہ دوسرے جانوروں کا شکار نہیں کرتا جب تک اسے بھوک نہ ستائے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جنگل میں شیرنی ہرنی کے نوزائیدہ بچوں کو شکار نہیں ہونے دیتی بلکہ کوشش کرتی ہے کہ وہ بچہ اپنے ماں یعنی ہرنی کے پاس پہنچ جائے۔ اسی طرح جنگل میں بھی جانور بہرحال شیر کو اپنا بادشاہ مانتے ہیں اور اس کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں یوں جنگل کا نظام منظم انداز میں چلتا رہتا ہے۔ جبکہ انسانی معاشرہ اس قدر زوال پذیری کا شکار ہے کہ یہاں انسان اپنے آپ کو بڑا کرنے کے لئے یا بڑا ثابت کرنے کیلئے دوسرے انسان کو اذیت سے دوچار کرتا ہے۔ پہلے پہل انسان دوسرے انسانوں سے بڑا ہونے کی طاقت حاصل کرتا ہے، پھر وہ اپنے ملک یا پھر ممالک میں افراد خود کو طاقتور بنانے کیلئے دوسرے ممالک کو تسخیر کرتا کرتے ہیں اور انسان اپنی سبقت برقرار رکھنے کے لئے ہزاروں، لاکھوں بلکہ کروڑوں انسان کا قتلِ عام کرتا ہے، پہلی جنگِ عظیم (1914-1918) اور دوسری جنگِ عظیم (1939-1945) میں ہمیں ملکوں کی آپس میں سبقت لینے کی جنگ میں کروڑوں انسانوں کا قتل عام نظر آتا ہے۔ اس سے قبل چنگیز خان کا دورِ ظلمت دیکھیں تو منگولیا سے اٹھنے والی آندھی کے نتیجے میں ہمیں اس وقت دنیا کی تقریباً کل 14 کروڑ آبادی میں سے 5 کروڑ انسانوں کا قتل عام نظر آتا ہے۔ ایسا ظلم شاید جانوروں کی زندگی میں بھی نہ ہو۔ شاید جانور بھی جنگل میں حکومت کیلئے اس قدر جانوروں کا قتلِ عام نہ کریں جو ہمیں تاریخ کے اوراق پلٹتے ہوئے نظر آتا ہے۔ خیر اگر ہم معاملاتِ زندگی کا عمیق جائزہ لیں تو ہمیں عورت ایک خوبصورت، بہادر اور طاقتور کردار نظر آتا ہے، جو جیتا جاگتا ہماری

زندگیوں میں آسودگی، چین، اور خوشیاں بھر دیتا ہے۔ اس لئے ہمیں عورت، پہلی عورت، دوسری عورت، تیسری اور چوتھی عورت کے تصورات، نظریات اور حقائق کا بنا کسی مذہبی، معاشرتی اور سیاسی تعصب کے جائزہ لینا ہوگا۔ یقیناً اگر ہم صرف عورت کو احترام، قدر و منزلت اور حقوق مہیا کریں تو ہمیں پہلی عورت کو ہی کل کائنات تصور کرنے لگیں۔ کیونکہ تا حال دنیا میں رائج رسم و رواجوں اور قوانین یا پھر جذبات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ہر عورت ہی پہلی عورت بننا چاہتی ہے۔ اگرچہ مشرقی معاشروں میں یہ خیال بہت ہی مضبوط ہے کہ یہاں مرد حضرات پہلی عورت کو ہی اپنی دنیا مانتے ہیں مگر وہ دوسری عورت کے خیال کو ہی پہلی عورت کو دبائے رکھنے کا نفسیاتی حربہ بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں اور پہلی عورت اپنے اندر موہوم ڈر کے سب مرد کی دنیا میں دبی رہتی ہے۔ حالانکہ حقائق اس کے برعکس ہیں کیونکہ مشرقی معاشروں میں بہر حال ہر مرد اپنی بیوی کے سامنے چاہے نہ ہو مگر اندر سے اپنی زوجہ ہی میں خود کو مضبوط محسوس کرتا ہے، وہ اس پہلی عورت کو ہی اپنی عزت، ناموس، غیرت، مروت، زندگی میں بہار اور کائنات میں رنگ بھرنے والی مصورہ تصور کرتا ہے۔ اگر اس پہلی عورت سے بچے پیدا ہو جائیں تو عورت خود کو معاشرتی سطح پر اور مضبوط محسوس کرتی ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی اولاد مرد کی وراثت میں پہلا حق رکھتی ہے اور اس سبب پہلی عورت کو مضبوطی ملتی ہے اور مرد بھی کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر سوچتا ہے کہ اب اس کی اولاد ہی اس کی زندگی ہے، یوں اولاد پہلی عورت کے لئے اپنے شوہر کی زندگی میں دوسری عورت لانے کا تصور معدوم کر دیتی ہے۔ جہاں اولاد نہیں ہوتی وہاں پیار ایک ایسا جذبہ ہے جو معدوم ہی سہی مگر جہاں پایا جاتا ہے وہاں اولاد کی موجودگی اور غیر موجودگی معنی نہیں رکھتی۔ بہر حال یہ ایک نادر تصور ہے اور تلاش کرنے سے ہی مثال ملتی ہے، وگرنہ مشرقی معاشروں میں اولاد ایک پیمانہ تصور ہوتی ہے۔ کچھ مرد حضرات کی قسم ایسی بھی ہوتی ہے جو دوسری عورت کو اپنی زندگی میں اس لئے لانا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں پہلی عورت سے عشق ہوتا ہے اور وہ اس عشق کو دوبالا کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ حضرات کو شوق ہوتا ہے کہ ان کی دو عورتیں ہوں اور دونوں سے بچے ہوں، وہ معاشرتی سطح پر مختلف ذاتوں یا علاقوں سے اولاد ہونے اور مستقبل میں مختلف انداز میں دکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ حضرات جن میں ہمت کی کمی ہوتی ہے یا کسی مصلحت کا شکار ہوتے ہیں وہ دوسری عورت قانونی حیثیت میں تو نہیں رکھ پاتے مگر معاشرتی رسم و

رواج کے مطابق دل کے کسی نہ کسی کونے میں دوسری عورت کو عملاً رکھتے ہیں۔ حالات حاضرہ میں اگر عمیق جائزہ لیا جائے تو ہمیں معاشرے میں ہر مرد کی زندگی میں کئی عورتوں کا غیر قانونی تصور نظر آتا ہے، اس کیلئے اگرچہ مغربی معاشروں کی مثال دی جاتی ہے مگر وہاں بھی حالات بالکل ویسے نہیں جیسے مشرقی معاشروں نے سمجھ رکھے ہیں۔ ایک دلچسپ صورتحال یہ بھی ہے کہ پہلی عورت مرد کی اس 'حرکت' کو برداشت کرنے پر قائل ہو جاتی ہے کہ اگر اس کے شوہر کی زندگی میں غیر قانونی طور پر "گرل فرینڈ" کی صوت میں اگر دوسری عورت وجود رکھتی ہے تو کوئی بات نہیں بلکہ وہ اس صورتحال میں خود کو قائم رکھنا چاہتی ہے، دراصل وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مرد کو اس قدر چھوٹ اس لئے دینا چاہتی ہے کہ چلو قانونی طور پر وہ اس کی سوکن تو نہیں بن پا رہی اور رہا مرد تو کب تک دوسری عورت کے ساتھ غیر قانونی میل جول رکھے گا۔ اگرچہ یہ ایک غیر موزوں عمل ہے اور زیادہ دیر تک جاری رہنے سے معاشرتی خلفشار بڑھنے کا اندیشہ بھی موجود رہتا ہے۔ حالانکہ اسلام میں جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہیں نہ کہیں منظم انداز میں گنجائش موجود ہے اور وہ بھی معاشرتی خلفشار کو سدھارنے اور معاشرتی توازن کیلئے جگہ رکھی گئی ہے۔ بلاشبہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت مشرقی معاشرہ اس وقت نازک صورتحال سے گزر رہا ہے جہاں پہلی عورت کو قانونی طور پر کوئی ایسا راستہ اپنانے پر خود کو قائل کرنا ہوگا کہ جو مذہب یا معاشرت دونوں میں سے کہیں نہ کہیں تال میل کھاتا ہوتا کہ معاشرے میں توازن بنا رہے۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ جہاں طلاق کی شرح بڑھ رہی ہوگی وہاں دوسری عورت کے قانونی تصور سے خواتین کے اندر معاشرتی فلاح کا پہلو بہر حال قائم رہے گا، دوسری طرف جہاں مشرقی معاشروں میں بہت سی قبیح رواجوں میں ایک رواج جہیز کا موجود ہے جس کے سبب کئی خواتین کی شادیاں مناسب عمر میں نہیں ہو پاتیں ان کے لئے گنجائش موجود رہے گی۔ ہاں یہ ہمیں طے کرنا پڑے گا کہ خواتین کے جذبات سے نہ کھیلا جائے بلکہ تمام معاملات کو جسمانی حظ سے نکل کر دیکھا جائے اور دوسری، تیسری یا چوتھی عورت کا جو تصور ہمیں اسلام یا کسی دوسرے معاشرے میں کچھ کمی بیشی سے ملتا ہے مکمل اس کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔ اب اس میں چاہے پیار ہو، اُنس ہو، وعدے یا وعیدیں ہوں، کچھ بھی ہو اگر سوچ میں معاشرتی فلاح کی بات موجود ہے تو شاید پھر دوسری عورت کے تصور سے پہلی عورت کو فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن شاید!

☆☆☆☆☆

''ادب کا خودسر، معاشرے کا باغی اور تعلیم کا ماہر''

کتابوں کا عشق سر چڑھ کر بولا تو الماریوں کی الماریاں کتابوں سے بھر دیں؛ نوکری کا سودا سر میں سمایا تو جونیئر کلرک سے لے کر ماہر مضمون اور پرنسپل تک کا سفر ایک ہی جست میں طے کیا؛ لکھنے کی جانب آئے تو صفحات کے صفحات لکھ مارے؛ ایوارڈز اور اعزازات کی بات چلی تو جھولیوں کی جھولیاں بھر دیں اور بے شمار اعزازات سمیٹ لئے - اصولوں کی بات چلی تو بڑے بڑے افسروں کے دانت کھٹے کئے ؛ زور، زیادتی اور نا انصافی کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے تو مخالفین کے خلاف مضبوط چٹان ثابت ہوئے - ظلم کے خلاف کھڑے ہوئے تو مخالفین کی گولیاں ہاتھوں پر روک لیں مگر ڈرے نہیں، خوفزدہ نہیں ہوئے، میدان چھوڑ کر بھاگے نہیں؛ ہر بے اصول، ظالم اور قانون چیلنج کرنے والے کے لئے ہر دم آستینیں چڑھائے لڑنے کے لئے تیار، تبھی تو گاؤں محلے اور معاشرے میں باغی اور خودسر کے طور پر پہچانے جانے لگے - جی ہاں بات ہو رہی ہے شیریں زادہ خدوخیل کی - صوبہ خیبر پختونخوا کے دور دراز پسماندہ ضلعے بونیر کے قابل فخر سپوت شیریں زادہ خدوخیل جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں خود کو منوایا - ان کے والد محترم وفاقی حکومت میں ڈپٹی سیکریٹری تھے مگر انہوں نے اسلام آباد میں شاندار نوکری قبول نہیں کی کیوں کہ والد کے بل بوتے پر ملازمت حاصل کرنا ان کے اصولوں کے خلاف تھا - اپنے علاقے میں جونیئر کلرک بھرتی ہو گئے - شدید ضرورت کے باوجود اپنی چھوٹی سی تنخواہ کا چوتھا حصہ کتابوں کی خریداری کے لئے

نور کمال شاہ

مختص رکھا اور آج تک اس معمول میں فرق نہیں آنے دیا۔ اس زمانے میں اپنے بیٹھک میں لوگوں کے لئے لائبریری بنائی جب پورے گاؤں میں بمشکل دس پندرہ پڑھے لکھے بندے ہی دستیاب تھے۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھے تو وہ معرکہ بھی کامیابی سے سر کرلیا اور ماہر مضمون مقرر ہوئے۔ بعد میں ترقی کرتے کرتے پرنسپل کے عہدے تک جا پہنچے۔ لکھنا شروع کیا تو اردو اور پشتو دونوں زبانوں کے دروازے ان کیلئے کھلتے چلے گئے۔ پشتو کی جانب آئے تو ناول، افسانے اور دیگر کئی اصناف پر لکھتے چلے گئے۔ اردو کی جانب توجہ کی تو افسانوں اور سیرت کی کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ سیرت نگاری میں تو ان کا کام تادیر یاد رکھا جائے گا۔ تاریخ اور گرائمر تک ان کی قلم کے زد سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پشتو میں اب تک ان کے دو ناول اور تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ناولوں میں "غازیان" اور "غانتول" شامل ہیں جبکہ "میتریا"، "خالی لاسونہ" اور "د ونختو لار" ان کے پشتو افسانوی مجموعے ہیں۔

اردو میں "دفعہ نمبر 182" ان کا افسانوی مجموعہ ہے اور مزید افسانوں پر کام جاری ہے۔ سیرت پر آج تک ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے بیشتر ایوارڈز کے حقدار قرار دی گئی ہیں۔ "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور رمضان المبارک"، "رسولؐ اکرم کا دسترخوان"، "رسولؐ اکرم اور خواب"، "بعثت نبویؐ پر مذاہب عالم کی گواہی"، "عہد نبویؐ کا نظام تعلیم اور عصر حاضر"، "تذکرہ خواتین اولیاء"، "عہد نبویؐ میں شعر و ادب" اور دیگر شامل ہیں۔ علاقہ خدوخیل کے سماجی، تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں لکھی ہوئی کتاب "میرا خدوخیل" بھی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ حال ہی میں اس کتاب کی دوسری ایڈیشن الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور کی زیر سایہ مارکیٹ میں آچکی ہے۔ اردو گرائمر پر ان کی کتاب "آئین اردو" بھی خاصی مقبول رہی ہے۔ "برصغیر میں مغل افغان کشمکش" ان کی تاریخی و تحقیقی کتاب ہے۔ محترم شیریں زادہ صاحب کو ملنے والے ایوارڈ اور اسناد کی اگر بات کی جائے تو انہوں نے کئی اسناد، ایوارڈز اور اعزازات اپنے نام کیے ہیں۔ اسناد امتیاز کے ساتھ ساتھ انہوں نے اب تک چچا کریم بخش ایوارڈ، خیبر پختونخواہ ادبی ایوارڈ، حافظ الپوری ادبی ایوارڈ اور اباسین آرٹس کونسل کا ادبی ایوارڈ بھی وصول کرلیا ہے۔

شیریں زادہ خدوخیل کا ادبی سفر ابھی جاری ہے اور امید ہے کہ سیرت و ادب کے قارئین تادیر ان کے علمی کاوشوں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

* کہاں سے چھیڑوں فسانہ کہاں تمام کروں *

شاید آپ نے *بیا* کا نام سنا ہوگا یہ چڑیا جتنی خوبصورت ہوتی ہے اتنا ہی خوبصورت گھونسلا بھی بناتی ہے یہ چڑیا گھونسلا بناتے وقت اس میں کچھ گیلی مٹی بھی جمع کر لیتی اور کچھ جگنوؤں کو اس گیلی مٹی میں دبا دیتی ہے تا کہ ان کا گھونسلا ان کے اور ان کے بچوں کے لیے روشن رہے دراصل اس چڑیا کے جگنو اکٹھا کرنے کی صفت سے میں ایک شخصیت کو مشابہت دینا چاہتی ہوں جنہوں نے اردو ادب کے کئی گمشدہ جگنوؤں کو منظر عام پر لایا ہے- امتیاز گورکھپوری نے کئی ادبی شہ پاروں کو ادبی دنیا میں روشناس کرایا ہے جن میں *یہ عشق نہیں آساں *، لفظ بولیں گے میری تحریر، شب و روز تماشا میرے آگے، اردو ادب کے ستارے، گرد سفر قابل ذکر ہیں-

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی وہ ملک کے ایک معتبر رسالہ "اردو آنگن" کے مدیر بھی ہیں جو بین الاقوامی سطح پر مشہور ہے جو آج ہمارے درمیان مہمان بن کر تشریف فرما ہیں جن کے اعزاز میں یہ خوبصورت نشست رکھی گئی ہے امتیاز گورکھپوری ایک عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب ہیں یہ نام کسی تعارف کا محتاج نہیں جیسا کہ میرا ماننا ہے "شاعر بنتے نہیں پیدا ہوتے ہیں" لیکن موصوف کے حوالے سے خاص بات یہ کہ انہیں شاعری وراثت میں ملی ہے ان کے والد محترم ظفر گورکھپوری صاحب نہ صرف ایک بڑے شاعر بلکہ ایک معتبر ادیب اور نغمہ نگار تھے جن کی غزلیں ملک و بیرون ملک کے گلوکاروں نے اپنی آواز میں گایا ہے جن میں "اب کے سال پونم میں، ایک طرف اس کا گھر ایک طرف میکدہ، پتھر کہا گیا کبھی شیشہ کہا گیا، کتابیں بہت سی پڑھی ہوگی تم نے، ہم جانتے ہیں تم ہمیں ناشاد کرو گے، دیکھ تماشہ لکڑی کا وغیرہ شامل ہیں- امتیاز صاحب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ " بے شک یہ

درخشاں انجم [کولکتہ]

ان کے لیے فخر و اعزاز کی بات ہے کہ یہ اپنے والد کے نام سے پہچانے جاتے ہیں اور آخری سانس تک یہ نسبت ان کی پہچان بنی رہے گی"

اگر امتیاز گورکھپوری کی شاعری کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ سہل ممتنع میں اپنی بات عوام تک پہنچانے کا گر جانتے ہیں میں ادب کی دنیا میں نووارد ہوں اس لیے ان کی شاعری کا کا احاطہ کرنا میرے لئے سمندر سے موتی نکالنے کے مترادف ہے ان کی نظمیں اور غزلیں تجربات اور مشاہدات کا شفاف آئینہ ہیں ان کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت دونوں دکھائی دیتے ہیں امتیاز گورکھپوری کی کچھ نظمیں اور کچھ اشعار آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتی ہوں:

نظم غبارہ

سمندر کے کنارے
شام ڈھلتے
خوبصورت دلنشیں ماحول میں
رنگینیاں جب
دل لبھاتی ہیں
سمندر کی لہریں
آ کے ساحل پر محبت کا حسیں نغمہ سناتی ہیں
انھیں رنگینیوں کے درمیاں
دو دل دھڑکتے ہیں
مہکتے ہیں گلابوں کی طرح
اک دوسرے کی بانہوں میں پھر آنکھیں ڈال کر
آنکھوں میں
اکثر خواب بنتے ہیں
لئے ہاتھوں میں غبارہ
وہ اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں
تمہیں کچھ یاد ہے جاناں
کچھ ایسے ہی
حسیں ماحول میں
میں نے تمہیں اک سرخ غبارہ دیا تھا
وہ غبارہ
کوئی معمولی غبارہ نہیں تھا
وہ میرا دل تھا
تم مانو نہ مانو
وہ جو غبارہ دیا تھا
میں نے
اس میں تمہیں میری سانسیں
میری سانسوں کو
سانسوں کے تم اپنے پاس رکھنا
اور ہمیشہ یاد رکھنا
وہ غبارہ
کوئی معمولی غبارہ نہیں تھا

.....

نظم تم سچ ہی کہتی تھی نا

تم سچ ہی کہتی تھیں
تم سچ ہی کہتی تھیں نا
اپنے بچپن کی
عادتوں کے حوالے سے
کہ تم

جس کھلونے سے کھیلتے کھیلتے اکتا جاتیں
جب تمہارا جی بھر جاتا
تو تم اسے توڑ دیتیں
تم سچ ہی کہتی تھیں

.....

کچھ اشعار ملاحظہ ہوں

ایک پل کو سہی خوشبوئے صبا تو آئی
اس کے گھر آنے سے کچھ تازہ ہوا تو آئی

.....

کیا ہے قتل کس نے یہ فسانے میں بتانا تھا
مگر یہ کیا فسانے سے ترے قاتل الگ کیوں ہے

.....

تمہاری ہاں میں ہاں دنیا ملائے جا رہی ہے
تمہارے فیصلے منظور ہوتے جا رہے ہیں

.....

حد سے گزرے تو پھر تمثیل رانجھا ہو گئے
عاشقی میں جانے کتنے لوگ کیا کیا ہو گئے

.....

کتنے لاشے بے کفن ہیں آہ تپتی ریت پر
پیاس دریا کے کنارے ہے لہو میں تر بہ تر

.....

امتیاز گورکھپوری ایک نامور شاعر ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہیں- ان کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ قلم کی عظمت کو بجا طور پر سمجھتے ہیں اور حتی المقدور اس کا حق ادا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں قلم تو بہت سے ہاتھوں میں ہوتا ہے لیکن قلم کی گراں بار ذمہ داریوں کو سہارنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں- جب ایک تخلیق کار کو شہرت کے ساتھ ساتھ عزت و احترام کی دولت بھی حاصل ہو تو اس کا فن قابل ستائش ہوتا ہے- امتیاز گورکھپوری ایک شخص سے اونچی شخصیت بننے کا بہترین سفر طے کر رہے ہیں- اردو زبان کی بقاء کے لئے امتیاز گورکھپوری کے اندر جو جذبہ اور جوش ہے اسے کوئی بھی محبِ اردو سراہے بغیر نہیں رہ سکتا- ان کی باتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں ادب کے دھندلائے ہوئے ان آئینوں کو صاف کرنا ہے جس میں تہذیب و تمدن کی تصویریں قید ہو گئی ہیں- انہیں ان خوفناک اندھیروں کو دور کرنا ہے جو ہمیں اردو پڑھنے اور لکھنے پر احساس کمتری کے خندقوں میں لے جا رہے ہیں- ادب کے آئینے پر پڑی ان گرد کو دھونا ہے جس میں اردو کے مستقبل کے درخشاں فسانے بھی دھندلائے نظر آتے ہیں انہیں ان رطب و یابس کو صاف کرنا ہے جو انگریزی کی غلامی میں قید ہو کر اسٹیج پر اردو کا نوحہ پڑھتے ہیں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امتیاز گورکھپوری کو دنیائے ادب میں وہ مقام عطا کرے جو ان کے والد محترم ظفر گورکھپوری کو حاصل تھا-

بقول فیض احمد فیض:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

☆☆☆☆☆

مینا ناز کی منفرد ناول نگاری

انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں انگلستان نے عروج حاصل کیا۔ اس دور میں ناول انگریزی ادب کا سب سے بہترین صنف ادب ٹھہرا اور ابلاغ کا اہم ذریعہ بنا۔ یہ مرد ناول نگاروں کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ یہ دور چارلس ڈکنز، کارلائل، رسکن اور تھامس ہارڈی کا دور کہلاتا ہے ایسے میں ایک خاتون کے لئے ناول نگاری میں مقام پانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا اس لئے میری ارون یا میرین ایونز نام کی ایک خاتون ناول نگار نے اپنے قلمی نام جارج ایلیٹ سے ناول لکھے جو ناول نگاری میں بہت بڑا نام بنا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اردو ناول نگاری میں بھی پیش آیا۔ وہ زمانہ خواتین ناول نگاروں کا تھا اور ان کے نام سے چھپنے والے ناول مارکیٹ میں آتے ہی گھنٹوں میں قارئین خرید لیتے مثلاً نذیر علوی، الطاف فاطمہ، انفال توصیف، فاطمہ ثریا بجیا، رضیہ بٹ، زینت عبداللہ چغتا، تہمینہ درانی، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ، اور زیتون بانو وغیرہ نے اردو ناول نگاری میں اک منفرد مقام حاصل کیا تھا۔

امین نواز ایک لیڈی ٹیلر ماسٹر۔ یہ بڑا باتونی مزاج رکھتا تھا۔ خواتین ان کی گفتگو سن کر محظوظ ہوا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ اپنے دل اور گھر کی باتیں تک ان سے شیئر کرتیں۔ یوں امین نواز کے پاس لکھنے کو کافی مواد حاصل ہوا۔ ادبی ذوق رکھنے کی وجہ سے اس نے ناول لکھنا شروع کئے۔ دن بھر ٹیلرنگ کا کام کرتے اور رات کو ناول لکھا کرتے۔

جب پبلش کرنے کے لئے پبلشر سے بات چلائی تو پبلشر نے اس کے ناول یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ یہ خواتین ناول نگاروں کا زمانہ ہے اور ان کے ناول کوئی اس وجہ سے نہیں پڑھے گا کہ اسے کسی مرد ناول نگار نے لکھے ہیں۔

مگر امین نواز بھی اپنی دھن کا پکا تھا نہ مانا اور ناول پبلش کرنے پر بضد تھا۔ تب پبلشر نے اس کا یہ حل نکالا کہ اسے امین نواز کے اصل نام کے بجائے کسی خاتون کے نام سے

گل اکبر خان

شائع کئے جائیں۔ تب امین نواز نے اپنے لئے مینا نواز نام پسند کیا مگر پبلشر نے اسے مزید کشش ڈالنے کے لئے مینا ناز کر دیا اور یوں امین نواز کے ناول مینا ناز کے نام سے شائع ہونا شروع ہوئے

مینا ناز کی چیدہ چیدہ ناول مندرجہ ذیل ہیں جو اس وقت میں نے پڑھے اور ان کے نام یاد ہیں

عزت؛ نصیب؛ دل؛ وحشی؛ فری؛ بدنام؛ ہرے کانچ کی چوڑیاں؛ سپنے میرے اپنے؛ یہ کارواں زندگی کے؛ پہاڑی چاند؛ جب جب پھول کھلے؛ رومیلہ؛ سپنوں کے پھول؛ درد آئے گا دبے پاوں وغیرہ

رومیلہ

مینا ناز کا یہ ایک شاہکار ناول ہے اور اس ناول کا پلاٹ نہایت ہی جامع اور مربوط ہے کرداروں کی ڈائیلاگ اور سین کا آپس میں ایسا ربط موجود ہے کہ ایک کو پڑھے بغیر دوسرا سمجھ نہ آئے پلاٹ حقیقی زندگی سے لیا گیا ہے اور ایسا پلاٹ ہمیشہ ناول کو شاہکار بنا دیتا ہے جو حقیقی زندگی سے قریب تر ہو ارسطو کے مطابق

Plot is the soul of a tragedy.

یعنی پلاٹ المیہ کی روح کہلاتی ہے کرداروں کے اندر جان پلاٹ ہی کے ذریعے ڈالی جاتی ہے پلاٹ مربوط نہ ہو تو کردار بے جان ہو جاتے ہیں اور بے روح و بے جان اشیا زندگی کو بے رونق و پھیکی بنا دیتی ہیں اس لیے مینا ناز نے کوشش کی ہے کہ اپنے ناولوں میں مربوط پلاٹ ڈالے اور وہ اس کوشش میں بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں کم از کم رومیلہ میں تو انہوں نے اس پر حد ہی تمام کر دی ہے دوسرے ناولوں کی پلاٹ کی بحث آگے آنیوالی ہے ان شاءاللہ جس پر بعد میں بحث کریں گے۔

ناول 'رومیلہ' کا پلاٹ

رومیلہ کا پلاٹ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک خودسر اور مغرور حسینہ جو کراچی جیسے بڑے شہر کے ایک امیر اور دولتمند باپ کی اکلوتی بیٹی ہے جو دولت کے بل بوتے پر اپنی خواہشوں کی تکمیل کرنا چاہتی ہے یہاں تک کہ وہ ایک مفلس اور قلاش ادیب کی اصولوں کا سودا کر ڈالتی ہے صرف اس وجہ سے کہ وہ ادب میں شہرت کمانا تو چاہتی ہے مگر ادب تخلیق کرنے کی وہ صلاحیت اس کے اندر

نہیں ہوتی اس لیے وہ رحمان جیسے قلاش انسان کو بلینک چیک دے کر اس سے ناول کا ایک غیر مطبوعہ مسودہ حاصل کر لیتی ہے ناول کا ہیرو رحمان اگر چہ اپنے اصولوں کا پکا انسان ہے اور ایک دن اس نے پروفیسر عقیل کو صرف اس وجہ سے کھری کھری سنائی تھی کہ انہوں نے رحمان کو اپنی مفلسی ختم کرنے کا ایسا ہی مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے چند مسودے کسی کے ہاتھوں بیچ کر اپنی مفلسی ختم کر کے بعد میں مسودے اپنے نام سے شایع کروا سکتا ہے اور اس دن سے رحمان کالج بھر میں مغرور اور خودسر کے نام سے مشہو ہو گیا لیکن چونکہ اسے رومیلہ سے محبت تھی اس لیے اسے انکار نہ کر سکا اور ادھورے خواب کے عنوان سے ایک ضخیم مسودہ بلا تردد رومیلہ کے حوالے کر دیا۔

اس ناول کا پلاٹ ایک ڈرامائی انداز لیے ہوے ہے جسکی کہانی جاندار کرداروں کے ذریعے پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے اس کے کرداروں میں اتنی جان ہے کہ پلاٹ کو جامعیت بخش دیتی ہے ڈرامائی انداز نے ناول کو حسن بخشا ہے اور اس وجہ سے میں بینا ناز صاحب کے اسی ناول کو شاہکار قرار دیتا ہوں اس پلاٹ میں پلاٹ کی وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جنہیں Unity of time اور unity of action کہتے ہیں اور جو بوطیقا میں بیان ہوے ہیں

کردار نگاری

اس ناول کے بنیادی کرداروں میں ہیرو رحمان اور ہیروئین رومیلہ کے علاوہ رحمان کا جگری یار صفدر رومیلہ کی سہیلی نازو سائیڈ ہیرو اور ہیروئین کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں جس سے کہانی میں مزید نکھار پیدا ہوتا ہے اگر ایک طرف رحمان سیریس مین ہے تو دوسری طرف صفدر مزاح کی چاشنی لیے ناول کو خوبصورتی بخش دیتا ہے صفدر ایک مزاحیہ کردار ہے جو اس ناول کا حسن کہلانے کا مستحق ہے اس کردار کی وجہ سے کہانی کا پلاٹ مربوط نظام لیے ہوے ہے

باقی چھوٹے موٹے کردار کہانی کو آگے بڑھانے میں کسی نہ کسی حد تک موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ مثلاً فیاض انور راحت سلمٰی مہ جبین اور پروفیسر عقیل وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

"صرف ایک حمورابی"

حمورابی قبل مسیح میں قدیم بابل کے پہلے شاہی خاندان کا چھٹا اور سب سے مشہور بادشاہ گزرا ہے - سمیر اور اکاد ''جنوبی عراق" کی شہری ریاستوں کو اپنی قلمرو میں شامل کیا اور لرسا کے ایلمی بادشاہ کو شکست دے کر اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا- یہ الگ بحث ہے کہ اس نے اتنے ڈھیر سارے کارنامے کیسے سر انجام دیئے - مگر وہ فتوحات سے زیادہ اپنے ضابطہ قوانین کے لیے مشہور ہے- حمورابی کا قانونی، آئینی اور اخلاقی ضابطہ دنیا کا سب سے قدیم ضابطہ ہے- جو 282 قوانین پر مشتمل ہے- اس میں آنکھ کے بدلے آنکھ, دانت کے بدلے دانت، اور قتل کے بدلے قتل کی سزا کا ذکر ہے- اور یہ بھی درج ہے کہ بیل گاڑی والے کا معاوضہ کتنا ہونا چاہیئے اور سرجن کا کتنا- اگر کوئی انجینئر پُل بنائے گا تو اسے اپنے خاندان سمیت اس پل کے نیچے سونا پڑے گا- اگر کوئی مکان گر جائے اور مالک مکان اس وجہ سے مر جائے تو معمار کو موت کی سزا ملتی تھی- اگر کپتان کی غلطی سے بحری جہاز تباہ ہو جائے تو کپتان کو نقصان کا ازالہ کرنا پڑتا تھا- کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ضوابط اسی سے ماخوذ ہیں - انجیل میں اس کا نام اُم رافیل "فرماں روائے شنار" (سمیر) ہے- ضابطہ قوانین میں عدالت، کھیتی باڑی، آبپاشی، جہاز رانی، غلاموں کی خرید و فروخت، آقا اور غلام کے تعلقات، شادی بیاہ، وراثت، ڈاکا، چوری وغیرہ سے متعلق قانون کے اصول بیان کیے گئے ہیں- یہ ضابطہ پتھر کی تختی پر کندہ ہے اور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے- حمورابی نے بکثرت عمارتیں بنوائیں اور نہریں کھدوا کر آبپاشی کا نظام درست کیا- اور اپنی سلطنت میں قانون کی بالادستی قائم کی-

افتخار ساحل

حمورابی کے مذکورہ 282 قوانین کو 12 عدد پتھر کی تختیوں پر لکھا گیا اور پھر آٹھ فٹ بلند پتھر کے ستونوں پر کندہ کروا کر بابل اور میسوپوٹیما کے دیگر شہروں کے بڑے چوکوں میں نصب کروا دیا گیا تاکہ ہر خاص و عام کی رسائی میں آسکے اور عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان سے آگاہ ہو سکے۔

حمورابی ایک زبردست کلدانی ساحر و ماہر طلسمات و روحانیات بھی تھا، اس کی طلسمات کے موضوع پر سب سے مشہور تصنیف (مکاشفات حمورابی) ہے جو (بابل) کے شہر ایم کی کھدائی کے دوران میں محلات کے کھنڈر سے پتھر کے کتبوں پر کھدی ہوئی برآمد ہوئی ہے۔

مصریوں نے بابل پر قبضہ کیا تو ان ستونوں کو بھی تباہی کا سامنا ہوا۔ بعدازاں اس ضابطے کا ذکر بھی تاریخ کی کتابوں سے حذف کر دیا گیا تاہم 1901 میں فرانسیسی ماہرین آثاریات نے پھر سے دریافت کیا تو دنیا ان قوانین سے واقف ہوئی۔ ان ستونوں میں حمورابی کو دیوتا مردک یا شمس سے یہ قوانین وصول کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہیں یہ بھی تحریر ہے کہ دیوتاؤں نے انسانوں میں حمورابی کو منتخب کیا کہ ان کے پیغام اور قوانین کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ بنے۔ جبکہ اس کی بادشاہی کا فیصلہ زمانوں پہلے ہی دیوتاؤں نے کر لیا تھا اور یہ بھی طے تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اکٹھا کر کے انھیں ایک عظیم سلطنت کی صورت دے گا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ حمورابی کے ضابطہ قانون کے اثرات غیر معمولی حد تک دیرپا اور دوررس ثابت ہوئے۔ جتنے بھی مذاہب اور ضابطہ ہائے قوانین اس کے بعد متشکل ہوئے، اس کے سائے سے ہٹ کر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکے۔ نہ صرف میسوپوٹیمیا کے عوام کی زندگیوں پر بلکہ آنے والے وقتوں میں مختلف تہذیبوں کے افراد کی زندگیوں پر بھی اس ضابطے نے اثرات مرتب کیے۔

بابلی تہذیب پہلی بڑی انسانی تہذیب مانی جاتی ہے جو دجلہ و فرات کے قرب و جوار میں ایک بڑی سلطنت کی صورت میں موجود تھی۔ حمورابی نے اسے قائم کیا۔ تاہم اس کی دلچسپیوں کا محور سماجی انصاف اور مساوات کا قیام تھا یہی وجہ ہے کہ اس نے انصاف کی ہر خاص و عام تک رسائی کو ممکن بنانے کے لیے قانون سازوں کی جماعت قائم کی اور اس کی سرپرستی میں ایک ضابطہ قوانین وضع کیا گیا جس میں پہلے سے

موجود سبھی معلوم ضابطوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔

گو اس سے پہلے بھی مختلف معاشروں اور قبائل میں قوانین موجود تھے لیکن ایک ضابطے کی صورت میں ان کی یکجائی دکھائی نہیں دیتی اور نہ ذہن انسانی اتنا ترقی یافتہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف ضرورتوں کے تحت کی گئی قانون سازی کو ایک ڈسپلن کی صورت دے اور قوانین کو ایک کوڈ یعنی ضابطے کی صورت میں ترتیب دے۔ حمورابی کی قانون سازی میں خصوصی دلچسپی کے باعث ایسا ممکن ہوا۔

ضابطے کو درجوں اور ابواب میں تقسیم کیا گیا اور مختلف تہذیبوں اور خطوں کے لوگوں، جو میسوپوٹیمیا کی زرخیز اور ترقی یافتہ خطے میں آن آباد ہوئے تھے، کے مزاج کو مدنظر رکھ کر قوانین، سزائیں اور جزائیں وضع کی گئی ہیں۔ جن موضوعات پر خاص طور پر اس ضابطے میں توجہ مرکوز کی گئی ہے، ان میں تجارت، خانگی معاملات اور انصاف کے سامنے سب کی برابر ذمہ داری اور جواب دہی قابل ذکر ہیں۔ تاہم سزاؤں کی بنیاد 'ہاتھ کے بدلے ہاتھ، آنکھ کے بدلے آنکھ' کے اصول پر قائم کی گئی ہے۔

اس طویل تمہید کو باندھ کر، میں آپ کو انسانیت کی ان کٹھن سفر، اور خاردار راہوں پر ایک بار پھر چند لمحوں کے لیے واپس لوٹنے کی فکری دعوت دینا چاہتا ہوں۔ اگر ہم ایک لمحے کیلئے اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکنے کی کوشش کریں۔ تو یہ معلوم کرنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ ہم نے حمورابی سے لے کر آج تک کیا کھویا اور کیا پایا؟ کیا ہم سے وہ وحشی، اور ناخواندہ انسان بہتر نہ تھا؟ جس نے اپنے معاشرے کو قانون کی بالادستی کے بل بوتے پر کھڑے ہونے کی استقامت بخشی۔

انسان نے ہر دور میں اپنے ماضی کو جاہلیت کے بھونڈے نام سے تعبیر کیا۔ جو سراسر سطحی پن، اور حقائق سے منہ موڑنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ آج ہم جب اپنے آپ کو مترقی اور باشعور انسان سمجھ رہے ہیں، عین ممکن ہے کہ ہمارے بنائے ہوئے پیمانے کو لے کر مستقبل کے انسان ہمارے اس مترقی دور کو زمانہء جاہلیت کہیں۔ جاہلیت بذات خود کوئی چیز نہیں، بلکہ انسانی رویے، عادات، اور برے اطوار ہی باہم مل کر جاہلیت بن جاتیں ہیں۔

ہمارے آج کا مترقی انسان ایک شتر بے مہار کی طرح، کوچہ کوچہ، قریہ قریہ، اور شہر شہر دندناتا پھر رہا ہے۔ مسجد، مدرسہ، سکول،

کالج اور یونیورسٹیوں میں یہی باشعور اور ماڈرن انسان انسانیت کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ ہمارے بچے گالم گلوچ، سے لے کر جنگ و جدل تک، کی ٹریننگ سے گزر کر انتہائی بھیانک اور رسوا کن نشوں کی بھینٹ چڑھتے ہیں۔ ذہنی، جسمانی، جنسی اور نظریاتی تشدد کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر، اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ موجزن ہے، جو تھوڑی دیر کے لیے بھی تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان حالات کی سنگینی کے ذمہ دار کون؟؟؟

قانون، انصاف، مذہب، علم، آگاہی، شعور اور نظریات کے نام نہاد پجاری عوام کو ایک دودھیل گائے سمجھ کر باہمی ساجھے داری، کے تحت دودھ پیے جا رہے ہیں۔ عدم تحفظ اور مرنے مارنے کے خوف نے آج کے انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ علاج اور دواؤں کے نام پر انسان کے رگ و پے میں زہر چھوڑے جاتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو دفنانے کے لیے بڑے بڑے مسائل کھڑے کیے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس افراتفری کے ذمہ دار کون؟؟؟

ہمارے ہاں قانونی نکات سے بھرے لدھے کتابیں ڈھیروں پے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ لیکن تھانے، عدالتیں، پارلیمنٹ اور کوٹ کچہری کاروباری مراکز اور دولت بٹورنے کے سوا اور کچھ نہیں -------افلاطون نے ایسے ہی قانون سے متعلق کہا تھا" قانون مکڑی کا وہ جال ہے، جس میں ہمیشہ چھوٹے چھوٹے حشرات تو پھنستے ہیں ----- لیکن "خونخوار" جانور اسے پھاڑ کر باہر نکل جاتے ہیں" اور یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک اجتماعی ڈپریشن میں مبتلا ہے۔ اب یہ ایک ایسا جنگل ہے جس میں ہر طاقتور، کمزور کو پاؤں تلے روند کر آگے بڑھنے کی کوششوں میں مصروف عمل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس لاقانونیت کو عدم مساوات کی بنیاد فراہم کرنے کے ذمہ دار کون؟؟؟

جب تک اس ملک میں قانون کی بالادستی قائم نہیں ہوتی، جب تک انصاف کی فراہمی کا فقدان ہوگا، جب تک ہم قانون کو اپنے انگلیوں پر نچانے کے لیے ناجائز سرمائے کا استعمال کریں گے، جب تک ہم مذہب کو اپنے عیبوں پر پردہ ڈالنے کے لیے متنازعہ کریں گے، جب تک ہم مریض کو کسٹمر، اور غریب کو "شودر" سمجھیں گے، اس وقت تک ہمیں حمورابی کے سنگین قوانین کی اہمیت اور ضرورت، کی احساس ہوتی رہے گی۔

☆☆☆☆☆

ضرورت رشتہ (طنز و مزاح)

پاکستان کی حسین و جمیل لڑکی کو ایک رشتہ درکار ہے----

بندہ دیانتدار بھی ہونا چاہیے اور تابعدار بھی ---- لیکن--- وزیر اعظم ہرگز نہ ہو--- فردوس عاشق اعوان جیسا دبنگ ہو ---- لیکن مرد ہونا چاہیے ---- بیگم کی خدمت کو ہی دنیا اور آخرت میں نجات کا وسیلہ دل و جان سے مانتا ہو --- شادی کو ستائیس سال بھی گزر جائیں --- تب بھی تا عمر ساتھ نبھائے --- پاک فین کی طرح چلتا جائے، چلتا جائے اور چلتا ہی جائے -----

محمد بن قاسم اور صلاح الدین ایوبی جیسی صفات کا حامل ہو--- اس کا تعلق وکالت کے پیشے سے ہرگز نہ ہو--- کیونکہ وکیل سب کچھ حاضر کرنے کے بعد بھی اپنے ہاتھ میں ہی گیم رکھتے ہیں --- استاد تو بالکل نہ ہو ---- کیونکہ عزت دار بندے کی ریکوائرمنٹ ہے --- ڈاکٹری بھی اس کا ذریعہ معاش نہ ہو----- کیونکہ دن رات وہ پھر ڈیوٹی ہی کرے گا----

مطلوبہ شخص کا کوئی رشتے دار نہ ہو--- خاص کر ، ماں، بہن، تو بالکل نہ ہو --- ورنہ ماں پین اک ہو جائے گی --- اور آخر میں پین دی سری رہ جائے گی---- کوئی دوست بھی نہ

سیدہ آمنہ ریاض

ہو۔۔۔بعد میں بھی چھٹ ہی جاتے ہیں۔۔۔
شاہ رخ خان جیسا رومانس کرنا جانتا ہو۔۔۔لیکن آبادی میں اضافے سے دل سے پریشان بھی ہو۔۔۔بیوی اپنی اور بچے اسے دوسروں کے اچھے لگتے ہوں۔۔۔
عامر لیاقت حسین، ساحر لودھی اور شیدے ٹلی سے سختی سے معذرت۔۔۔
دل پھینک عاشقوں اور ٹھرکی بڈھوں سے معذرت۔۔۔۔شاعروں، ادیبوں سے ہتھ جوڑ کے معذرت۔۔۔۔۔۔
ہر سال ورلڈ ٹور پر لے جائے۔۔۔یہ دورے حکومتی کھاتے میں بالکل نہ آئیں۔۔۔
تاکہ نیب سے بچت کے پورے چانسز ہوں۔۔۔ماضی کا غم اور مستقبل کی فکر نہ رکھتا ہو۔۔۔اسے فکر ہو تو بس بیگم کی۔۔۔
بیگم کے رشتے داروں کی خدمت کا جذبہ کوٹ وٹ کر بھرا ہو۔۔۔ٹور نوابی ہو۔۔۔
چال شرابی ہو۔۔۔سر گھمائے تو بال سلو موشن میں اڑ کے واپس آئیں۔۔۔
شیر جیسا بہادر ہو۔۔۔ہاتھی جیسا طاقتور ہو۔۔۔چیتے جیسی تیزی ہو۔۔۔
ایک سبق اس کو مکمل ازبر ہو۔۔۔جی بیگم! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔
ٹھیٹھ پنجابی جگتیں مارنے میں ماہر ہو۔۔۔۔
چوری چھپے دوسری عورتوں سے اکھ مٹکے کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی۔۔۔اس کا سٹینڈرڈ ہائی فائی ہونا چاہیے۔۔۔ہمسائیوں، دوستوں اور رشتے داروں کی بیویوں کو ہرگز خاطر میں نہ لاتا ہو۔۔۔حتیٰ کہ حوروں کا بھی طلبگار نہ ہو۔۔۔پیسے اور دولت کی ریل پیل ہو۔۔۔۔گاڑی بنگلے، بنک بیلنس۔۔۔۔جو بھی ہو۔۔۔سب بیوی کا ہی ہو۔۔۔۔بیگم پر اپنی جان تک نچھاور کر دے۔۔۔ویسے بھی ایہو جئی زندگی دا کرنا وی کی اے؟؟؟ہاں کھال شوکت خانم کو دی جا سکتی ہے۔۔۔اس کی زندگی کا مقصد انٹرنیشنل رن مرید لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ حاصل کرنا ہو۔۔۔
کسی بھی سیاسی، مذہبی، ثقافتی جماعت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔۔۔۔جلسے جلوسوں میں جانا پسند نہ ہو۔۔۔گھر بیٹھ کر ہی سیاسی جماعتوں پہ چار حرف بھیجنے کا ماہر ہو۔۔۔
نوٹ: اگر اس تحریر کی خاصیت یہ ہے کہ شروع میں آپ کو یہ ماورائی حقیقت اور مہاتما گاندھی کی نئی بکواس لگے گی۔۔۔لیکن جوں جوں آپ پڑھتے جائیں گے۔۔۔آپ کو لگے گا کہ آپ بالکل اس معیار پر پورا اترتے ہیں۔۔۔ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں اور شادی شدہ زندگی پر نظر ڈالیں۔۔۔۔
ہاں! اگر ایسا کوئی جنتی بہشتی بندہ مل جائے تو اسے تھاں مار دیں۔۔۔کیونکہ شادی کر کے بھی ایہو کم ہونا اے۔۔۔

☆☆☆☆☆

مجبوری

وہ شہرِ تنگ دِل کی تنگ تر گلیوں میں اُتری تھی،
اُسے، اک پل، گھڑی کی طرح ٹِک ٹِک کرتے دِل کا ساتھ
دے کر چل دیا تھا، اور ______ پھر ہر آنے والا پَل اُسے بچہّ
سمجھ کر اُس کو کچھ اوپر کی جانب کھینچ کر آگے نکل جاتا، اسی باعث
وہ تن اِک رات، مجبوراً جوانی کی حدوں میں پھاند آیا تھا، سلونا
جسم خونیں گردشوں کے ساتویں چکّر کی زد پر تھا
مر آئینہ کانسی کا تراشیدہ بدن اُبھرا، کمر پہ دو تکونیں
راس کے بَل، ناف کے نزدیک، مِل کر ______ دائرہ بن کر ______
سلونی سی کٹوری میں گھُلی تھیں، ریڑھ کی ہڈی کے دونوں
سمت کولھوں سے کچھ اوپر چھوٹے گہرے گہرے
سے گڑھے، سارے بدن پہ فالتو چربی نہ ہونے کی علامت
تھے، یہ دو آنکھوں کے حلقوں سے گڑھے پَل پَل اُدھوری
زندگی ڈھونے کے شاہد تھے، کماں رانیں گلی کے موڑ
سے پانی بھرے برتن اُٹھانے کی گواہی تھیں، وہ قوسی
پنڈلیاں دن رات کی محنت کے مرکز سے اُبھرتی
تھیں ______ سلونا، سانولا چہرہ، سلونی سانولی قوسیں،
سلونے سانولے کُولھے، بتاتے تھے کہ وہ اک عُمر چُولھے
کی تپش افزا شعاعوں میں نہائی ہے کہ دریا کے کنارے
آفتابی غسل تو اُس کا مقدّر ہو نہ سکتا تھا، وہ چہرے کی نمایاں
ہڈیاں گالوں کے بالکل کھوکھلا ہونے کی مظہر تھیں ______
سلونا جسم شہرِ تنگ دل کی تنگ سی گلیوں میں کھلتی تنگ تر
کوٹھڑی کے اک تاریک تر گوشے میں عریاں تھا، گھڑی کی
طرح ٹِک ٹِک کرتے دِل کے ساتھ اُس نے پھر پلِس

آئینہ جھانکا تھا، سرِ آئینہ اُس کو اپنے چھوٹے تنگ کولھے، تنگ کاٹھی کے تناظر میں مناسب لگ رہے تھے ریڑھ کی ہڈی کے دونوں سمت کولھوں سے کچھ اوپر چھوٹے چھوٹے گہرے گہرے سے گڑھوں تک آتے آتے بال موجیں بن چکے تھے، سر جھٹکنے پر وہ کالے بال کچھ روشن لکیریں چھوڑتے تھے تو سرِ بستر سلگتی شمع کی لَو ڈگمگا جاتی، سرِ بستر دمکتی لَو اُسے جب اپنی قوسوں کی چمکتی جلد میں عریاں نظر آئی تو اس کے پُرکشش سینے کے سب اسرار عرّیاں تھے، اُبھرتی پسلیوں کے دائرے سے کچھ اُترتے اوج پر پانی کے پتھرائے ہوئے دو ٹھوس قطرے جُھک رہے تھے، شہد سے میٹھے جھکاؤ میں سہاروں سے مکمل بے نیازی تھی، مگر یہ پُرکشش بوندیں سلونے سانولے تن کے توازن کو بگاڑے دے رہی تھیں، شمع کی لَو بھی لرز کر رہ گئی تھی، کان کی لَو میں حرارت بھر گئی تھی، دائروں پر سانولے ہاتھوں کی جنبش تھم گئی تھی، پُشت سہلاتی ہوئی ماں کو جھڑک کر صحن میں لیٹا ہوا بوڑھا یہ کہہ کر نیند کی آغوش میں جانے ہی والا تھا، ”بدلتی رُت ذرا دم لے تو دیکھیں گے ______ یہ مہنگائی کہیں تھم لے تو دیکھیں گے۔“

خالد احمد

دل کی کیا بات کریں

دل کی کیا بات کریں!
کسی بگڑے ہوئے بچے کی طرح
ایک ہی ضد پہ اڑا بیٹھا ہے
چاہتا ہے کہ کبھی
جس کی تخلیق ہے وہ
اُس مصوّر کو وہ ایسے دیکھے
جیسے وہ اُس کی طرف دیکھتا ہے
اُس سے کچھ بات کرے چُھو کے اُسے دیکھ سکے
ہر کسی رنگ کو وہ
اُس کی نظر سے دیکھے
اور یہ جان سکے
اُس کو جس آخری منظر میں امر ہونا ہے
وہ پتا ہے کہ نہیں!
جو بھی رنگوں کے، لکیروں کے خم و پیچ میں ہیں
اُس کے چہرے کے نقوش
اُن کے بارے میں ابھی
فیصلہ کوئی ہُوا ہے کہ نہیں!
اُس کی تصویر سے مطلب تو نہیں ہے لیکن
یہ تمنا ہے کہ بس
ایک لمحے کو سہی
خود کو اس اَن بنے منظر میں کہیں دیکھ سکے
نقش گر اُس کی بصارت سے ہوا ہے تو چلو
بالمقابل نہ سہی
اُس کی تصویر کے پیکر میں کہیں دیکھ سکے!

امجد اسلام امجد

کون بتلائے اِسے

یہ وہ صورت ہے کسی طور جو ممکن ہی نہیں

کسی منظر کے مقدّر میں نہیں

خود کو وہ دیکھنے والوں کی طرح دیکھ سکے

کسی قطرے کے تصور میں نہیں آ سکتا

کہ وہ دریا سے جدا ہو کے بھی دریا دیکھے!

(کیسے ممکن ہے تماشے کو تماشا دیکھے)

دل سے یہ کون کہے

نقش کے ہاتھ میں ہوتی ہے کہاں نقش گری!

عکس آئینے کے اندر تو اُتر سکتا ہے

نہیں ممکن کہ وہ خود اپنا بھی چہرہ دیکھے

یہ تو ممکن ہے اُسے دیکھ رہی ہو دنیا

کیسے دنیا سے الگ ہو کہ وہ دنیا دیکھے!

مگر یہ بتاؤ

یہی بات سچ ہے
بنی نوعِ انساں
اسی کھنکھناتی ہوئی خاک سے
ایک زندہ اکائی کی صورت اٹھے ہیں
اسی خاک میں جا ملیں گے
مگر یہ نہ جانا کہ آنے کا مقصود و مفہوم کیا ہے
وہ کثرت میں اپنی حقیقت کو بھولے
انھیں کون خانوں میں تقسیم کرنے کو آیا
وہ قابیل بھی ہیں وہ ہابیل بھی ہیں
وہ ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی ہیں
کہ اپنے بنائے ہوئے
دامِ تزویر میں جاگرے ہیں
سفر زندگی کا تو جاری رہے گا
مگر یہ بتاؤ
کہ جنگ و جدل، نفرتوں کا الاؤ
یہ غیظ و غضب
کیا سفر میں یہی توشۂ آخرت ہے

یہی بات سچ ہے
بنی نوعِ انساں
اسی کھنکھناتی ہوئی خاک سے
ایک زندہ اکائی کی صورت اٹھے ہیں
مگر یہ نہ جانا
کہ آنے کا مقصود و مفہوم کیا ہے

حسن عسکری کاظمی

لمحہ کوئی

وحدتِ وقت کی چھوٹی سی اِکائی لمحے
ریت کی طرح یہ مُٹھی سے پھسلتے لمحے
لمحے تتلی ہیں اُڑ جاتے ہیں
چھوڑ کر رنگ ہتھیلی پہ مگر
مستعار آئے ہوئے رنگ کی کیا عمر بھلا
چُھوٹ گیا
لمحے تو پھُول ہیں، کِھلتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
گھول جاتے ہیں یہ خوشبو بھی ہواؤں میں
مگر کتنی دیر
لمحے خوش رنگ پرندے ہیں چہک اُٹھیں تو
وہ جگا دیتے خوابیدہ فضا
اور کچھ دیر میں پھر
اجنبی دیسوں کو اُڑ جاتے ہیں
لمحے تو نغمے ہیں
لہر در لہر جو سُر بن کے بہیں
چھیڑ کر تار دلوں کے اکثر
اپنی ہی گونج میں کھو جاتے ہیں
لمحے شبنم بھی ہیں
ہوں وہ رُختار پہ یا پھُولوں پر
ٹوٹ جاتے ہیں یہ سیال نگیں
جیسے یہ تھے ہی نہیں
گزرے لمحوں کے تعاقب میں کوئی جائے تو کیسے جائے
وقت کی تیز ہوا ان کے نشاں تک بھی مٹا دیتی ہے
یوں بھی ہوتا ہے کبھی لمحہ کوئی
شاخِ دل سے یوں اُلجھ جاتا ہے
جس طرح ڈور اٹک جائے کسی ٹہنی سے
اور پتنگ ایسے ہی بے سمت اُڑی جاتی ہے
یہ جو لمحے ہیں یہ ٹکڑوں میں بٹے ہم خود ہیں
اپنے ہی ٹکڑوں پہ دھر دھر کے قدم
پار کر جاتے ہیں ہم وقت کی سرحد اِک دن
واپسی کے کسی اِمکاں کے بغیر

فرحت پروین

اک چوکور سی شب

دھوپ سے ہم نے حرف بنائے تھے
پھر بھی
کاغذ تاریکی سے بھرتا جاتا ہے
خستہ دیواروں پر لٹکے
لفظوں سے مرجھائے چہرے
چیٹ روم کی گہرائی میں بھٹکتے سائے
آزادی کے بُت کو چھونا چاہتے ہیں
لمحوں کے یہ قیدی
ٹیالے سویروں جیسے
یہ برقی سی لہریں
اک دوجے میں الجھتی سڑکیں
ٹی ہاؤس کی بحثیں
روشنیوں کا ایک ہجوم ہے
پھر بھی زخم اندھیروں جیسے
کھڑکی کھڑکی
شام میں مدغم ہوتا منظر
اک چوکور سی شب میں ابھرتا جاتا ہے
کاغذ تاریکی سے بھرتا جاتا ہے

حامد یزدانی

دُھواں

وہی دبیز سردیوں کی دھند تھی
تری گلی میں شام جب
سیاہ رات کا نقاب اوڑھ کر
بھٹک گئی
تو ڈووووور۔۔۔
آخری مکان کی اجاڑ کھڑکیوں کے پاس
اک دیا سا
ٹمٹما کے بجھ گیا، خیال کا
دھواں مچل رہا ہے آج بھی
وہاں، سوال کا

رات

رات اے رات
رات مجھے اچھی لگتی ہے
رات کبھی تو ختم نہ ہو
تری صبح کبھی نہ آئے
دن کی جلتی دھوپ
مرے جیون آنگن میں
خار ہی خار بچھائے، تن میں آگ لگائے
تری صبح کبھی نہ آئے
رات نکلنے سے پہلے ہی
صبح کا سورج
جنگل کے پیچھے گر جائے
جسم کی بوجھل گٹھڑی جب میں
مٹی کے بستر پر رکھ کر
خاموشی سے پاس ترے جب آتی ہوں
چاند کی آہٹ سایہ بن کر
خواب نگر کے در کھولے ہے
رات مجھے اچھی لگتی ہے
تیرا اک اک تارا میری کھلی ہوئی بھیگی پلکوں پر
یاد کے دیپ جلائے
تیرے مدھم چپ چپ جھونکوں سے میں نے کب
دل کے راز چھپائے
رات سمندر تیرا ساحل، ٹوٹی بے کل آشاؤں کی ناؤ ہے کھیتا جائے
رات مجھے تو ساتھ ہی لے چل، چاند کے سائے سائے
منزل منزل چلتی جاؤں، راہ میں گھر آجائے!

رخشندہ نوید

کسی اور سے محبت ____

تو کسی اور سے محبت کر،
میرے حیرت کدے میں پاؤں نہ رکھ
دل کے آئینہ خیال کی لو
آنکھ کو خیرہ کر بھی سکتی ہے
جو محبت تری حیات کی ضو
وقت کے ساتھ مر بھی سکتی ہے
تو کسی اور سے محبت کر!
میرے حیرت کدے کا رُخ مت کر
اس کے دیوار و در پہ کندہ ہیں،
ایسے نقش و نگار جذبوں کے
جو تری فہم سے گریزاں ہیں،
میری چاہت کے مند دھارے میں
خواب اور جستجو کی بستی تک
گہرے دریا سی میری ہستی تک
ناؤ کاغذ کی ساتھ لائے گا
من کے ساگر کی اجلی موجوں میں
تو اترتے ہی ڈوب جائے گا
تو ____!
تُو وہی زلف کا اسیرِ کہن
ساحلوں پر تلاش کرتا ہے
نیلگوں پانیوں کی جل پریاں
یونہی اِسی راہگزر پہ چلتے ہوئے
میرے ساحل پہ آن ٹھہرا ہے
چار دن کی بہار کے پنچھی
بحرِ الفت بہت ہی گہرا ہے
تو کسی اور سے محبت کر!
میری آنکھوں میں آرزو کا ہدف
اک یقیں کی تلاش میں گم ہے
ذات میری انہیں جزیروں پر
اس کنارے کی راہ تکتی ہے
جو مری روح سے گزرتا ہے
من کے ساگر کی سُست موجوں کو
ایک گوہر میں ڈھلتے دیکھا ہے
آرزوؤں کے پارٹیلوں پر
آس کا دیپ جلتے دیکھا ہے!!

رخشندہ نوید

ناسٹلجیا

پھر کسی یاد کی
پگڈنڈی پر
چلتے چلتے
ہم بہت دور نکل آئے ہیں
پھر تخیل سے
کوئی دور پُرانا گزرا
صبح جب جاگتی تھی
پھول کھلا کرتے تھے
دن تیری یاد میں
جلدی سے گزر جاتا تھا
شام کے دھندلکے
بھی خوب ہوا کرتے تھے
چلتے چلتے یونہی صرصر نے
مرے کان میں سرگوشی کی
زندگی یوں کبھی
تنہا تو نہیں ہوتی تھی
پھر کسی یاد کی
پگڈنڈی پر
ہم بہت دور نکل آئے ہیں

طلعت شبیر

"بیت جائیں گے یہ لمحات"

ایسے حالات کبھی پہلے نہیں دیکھے تھے
جیسے حالات زمانے نے دکھائے ہیں ابھی

سہم جاتا ہے مرا دل جو یہ بجلی کڑکے
کالے بادل تو ہر اک سمت میں چھائے ہیں ابھی

جن کی اوقات فلک نے ہے نمایاں کر دی
اہلِ دنیا سے وہ چہروں کو چھپائے ہیں ابھی

بوجھ خود کا بھی اٹھایا نہ گیا پر کچھ لوگ
بار اَوروں کا بھی کندھوں پہ اٹھائے ہیں ابھی

اہلِ ہمّت نے نہ مسموم فضا کو دیکھا
جام بھر بھر کے محبت کے پلائے ہیں ابھی

وقت جیسا بھی ہو ہر وقت سفر میں ہے نا
بیت جائیں گے یہ لمحات جو آئے ہیں ابھی

میرے ماتھے کی لکیروں پہ گزارہ کر لو
میں نے کب رنج سبھی تم کو سنائے ہیں ابھی

اقبال سروبہ

حی علی الفلاح

[نثری نظم]

آنکھوں سے
مقدس جگہوں پر
بم گرتے دیکھو
بچوں کی چیخیں سنو
عورتوں کی سینہ کوبی
نظر انداز کرو

کیا ڈھونڈتے ہو
کون سا شہد
اور کیسا چھتہ
تم تو
صدیوں سے
جسموں کا نمک چاٹنے والے
حرام خور ہو
تمھیں نسوانی حسن کی ملائمت سے
عشق ہے
دولت سے پیار ہے
چھوٹ اور فریب تمھاری پناہ گاہیں ہیں
عالمی منڈی

تمھیں محض گاہک کا درجہ دیتی ہے
تم صرف
اپنوں کے ساتھ لڑ سکتے ہو
دنیا میں
تمھارے علاوہ سب کافر ہیں

ایسا کرو
احتجاج کرنے کی تیاری کرو
بینرز بناؤ
سنا ہے
کل ایک ملک گیر جماعت نے
ہڑتال کی کال دی ہے

امجد بابر

نظم

اے امین کنجاہی!
کب سماج بدلے گا
ہر طرف اندھیرا ہے
مفلسی کا ڈیرہ ہے
بھوک ہے غریبی ہے
زیست موت جیسی ہے
سانپ آ کے ڈستے ہیں
مشکلوں کے رستے ہیں
بوجھ ہیں مسائل کے
کب سیاہی اُترے گی
روشنی کے چہرے سے
کب ملے گی خوشحالی
کب بہار اُترے گی
پیلے زرد چہروں پر

امین کنجاہی

نظم

مجھے تنہا نہیں کرنا
مجھے تم سے یہ کہنا ہے
مرا کوئی نہیں ہے
جو کہ میری ذات
کو سمجھے
مری ہر بات کو سمجھے
گزارش ہے فقط
اتنی
مری تنہائیوں
میں تم کبھی آ کر
مجھے آباد کر دینا

نظم

[فلسطینی بھائیوں کے لیے]

ہو گئے قتل صداقت کے علم دار یہاں
کوئی سمجھا نہ مرے شہر کے آزار یہاں
رقصِ ابلیس نظر آتا ہے چاروں جانب
سوچ میں گم ہیں مرے صاحبِ دستار یہاں
ہوش میں آئیں گے کب لوگ مرے مردہ ضمیر
لب ہیں خاموش نہیں جرأت انکار یہاں
ہر طرف خون ہے بکھرا ہوا بچوں کا مرے
روز محشر کے نظر آتے ہیں آثار یہاں
کل جنھیں ناز تھا ظالم کی رفاقت پہ بہت
اب وہ معصوم سے چہرے ہیں سرِدار یہاں
ظلم کو ظلم بھی لکھتا نہیں منصف کوئی
عیش و عشرت کے سبھی گرم ہیں بازار یہاں
اپنے ہی خون کے قاتل ہیں سبھی لوگ مرے
کھیل جاری ہے یہ کیسا پسِ دیوار یہاں
کون لکھے گا مرے شہر کا نوحہ کہ حکیم
ہو گئے دفن محبت کے قلمکار یہاں

حکیم خان حکیم

نثری نظم

زندگی سراب ہے سوچتا کوئی نہیں
اور اسی دھوکے میں
خواب در خواب دیکھتے رہتے ہیں
مگر جب نیند کی فصیلوں پر
گماں نقب لگاتے ہیں
بڑوں بڑوں کے حوصلے بھی مات کھا جاتے ہیں
آرزو کی گیرائی فکر کی شورشوں سے کب تک
برگشتہ رہے
رات کے سمندر سے آدرش کے موتی چن کے جو
مالا پروئی تھی
ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتی ہے
چن کے موتیوں کو پھر پرو بھی لیں تو کیا
وہ پھبن نہیں رہتی
ایک بار زندگی جن رستوں سے لوٹ آئے پھر
وہاں اسی رفتار سے رواں رہ نہیں سکتی
لاکھ بنت کرو
ایک جھٹکے سے ٹوٹ جاتی ہے

نائلہ راٹھور

نوحہ

شہر کے سارے باسی اپنی
سندر آنکھیں گروی رکھ کے
اونچے اونچے ایوانوں میں آن بسے ہیں
بستی ساری
رنگوں کی پہچان سے عاری
گیت کی سندر تان سے عاری
پیار کے رشتے ان پر بھاری
دل.....! تو کتنا پاگل سا ہے
ان لوگوں سے شکوہ کیسا.....
شہر تو سارا انا بینا ہے
بل کھاتی یہ بہری گلیاں
گونگی راہیں
کون سنے گا تیری آہیں
آ پگلے! ہم دونوں مل کے
اپنی سماعت
اور بصارت.....گروی رکھ دیں

نیلے ہونٹوں کی گواہی

کہنے والے یہ کہتے ہیں
آج ہوائیں
شہر میں امرت بانٹ گئی ہیں
سب کی نظریں اجلی اجلی
سب کے چہرے نکھرے نکھرے
لیکن پیارے
بانجھ گھٹائیں
اپنی بستی کے کوچوں میں
جب بھی آئیں
پیار کی بوندیں روٹھ سی جائیں
نفرت کے زہراب میں لتھڑی
ایک کسیلی دھوپ بچھائیں
ہم سے روٹھیں سارے سائے
کون ہوائیں.....؟
کیسا امرت.....؟
نیلے ہونٹ گواہی دیں گے
قطرہ قطرہ زہر پیا ہے
تیرے شہر میں کون جیا ہے.....؟

افتخار بیگ

مرشد

کوئی پیرولی کوئی مرشد ہو
جو درد پروئے دھاگے میں
اور دور کہیں پر پھینک آئے
پھر سکھ لکھوا دے بھاگے میں
میرا سچا لیکھک روٹھ گیا
میں گھنگھرو باندھوں پیروں میں
یا جنگل جا بسرام کروں
یہ دنیا کھیل تماشا ہے
اب اس میں کیا گزران کروں
میرے نیناں رو رو نیر ہوئے
مجھے نیند نہ آئی ہفتوں سے
کوئی پیرولی کوئی مرشد ہو
جو موڑ لے آئے ماہی کو
کسی گہرے نیلے پانی میں
کرے دفن وہ درد سیاہی کو
میرے خوابوں کو تعبیر کرے
میری کھوئی روح تسخیر کرے
میرے دل میں زخم جدائی کا
میری روح بھی نیل و نیل ہوئی
مجھے اپنا آپ بھی بھول گیا
میں کیسا پھول، ببول ہوئی
میری ذات ہوئی اک افسانہ
میرا سچا لیکھک بھول گیا
جب بھول گیا میں دھول ہوئی
میں کیسا پھول، ببول ہوئی
کوئی پیرولی کوئی مرشد ہو
جو ٹھڑا یار منا لائے

رخسانہ سمن

خطوط

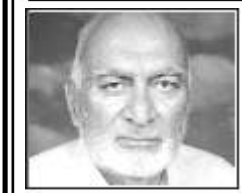

آصف ثاقب

جدید تر ادب کے داعی پیارے عمران منظور صاحب

السلام علیکم! اب کے 'بیاض' دل بے قرار کا قرار بن کر جلد آیا۔ گویا ادب کے گل و گلزار سج گئے انور شعور کا مطلع ''برق'' ثابت ہوا۔

آنے کے لیے آ ، فقط آنے کے لیے آ
اے دوست کسی روز نہ جانے کے لیے آ

پینا پلانا چھوڑ و صرف ملنے ملانے کو آیا کرو، خیر باشد۔ آپ نے دور کے گاؤں کے اس ''شاعر' کو ایک بار پھر خرید لیا۔ کتاب ''پاکستانی ادب کے معمار'' کا عکس ٹائٹل کے اندر بہار دکھا رہا ہے۔ آپ کی مہربانیاں ''بوئی'' کو نکھار سنوار رہی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان (اسلام آباد) نے میری محنت کا، جیسی کچھ بھی ہے صلہ دے دیا ہے۔ اس طرح ایک ذرے کو روشن روشن کر دیا۔ چند دن پہلے یہاں بوئی میں اس کتاب کی رونمائی ہوئی آزاد کشمیر اور ہزارے کے مشاہیر ادب کی شرکت سے محفل چندے مہتاب سے چندے آفتاب رہی۔ احباب کی تقاریر اور مضامین سے ایک ''غریب الدیار'' کی خوب حوصلہ افزائی ہوئی۔ مشہور شاعر احمد حسین مجاہد نے اپنی تحریر سے کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ احمد حسین مجاہد قلم کے دھنی ہیں۔ ان کی نثر بھی دل پذیر اور شاعری بھی دل ربا ہے۔ انھوں نے اپنی من موہنی تحریر سے، اس خاک نشیں کو کرسی پر بٹھا دیا ہے ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

خالد احمد کی غزل نے 'بیاض' کو جوہر ریز کر دیا ہے۔ اس غزل کی بحر کے پس منظر میں طوفان اُٹھاتی جذبات کی لہریں بے خود کر رہی ہیں۔ خالد احمد سے غزل کی خود ساختہ اور از خود رفتہ آہنگ دیا ہے یہ دلنشیں آہنگ شاعری کو عزت مندی اور خوش بختی سے متمول کر رہا ہے۔

آپ ہر مہینے شروع میں خالد احمد کی شاعری شائع کر کے رسالے کی قدر و قیمت میں معتد بہ اضافہ کر رہے ہیں۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو میں نے اپنے خط میں مشہور شاعر طالب انصاری کا ذکر کیا انھوں نے بھی مجھے یاد کیا ہے۔ طالب انصاری ہزارے میں تھے تو شعر سنانے ہمارے پاس مشاعروں میں آتے رہتے تھے بہر نوع سلسلہ ٹوٹا نہیں۔ ان کا کلام رسالوں میں پڑھنے کو ایک تسلسل کے ساتھ مل رہا ہے۔ اس 'بیاض' میں بھی ان کا کلام پسند آیا۔ یہاں سے تو ہم نے ان کو جوان جوان بھیجا تھا۔ بہر طور شاعری میں جوانی لہریں لے رہی ہے۔ آفتاب احمد ملک حوصلہ افزائی کے قرینے جریدہ جریدہ برتتے ہیں۔ محبت اور خلوص سے دوستوں کو خوش کر دیتے ہیں۔ محترمہ بلقیس ریاض کا خاموش آنکھیں پڑھا۔ تجسس اور تلاش سے بہت سی خاموش آنکھیں سامنے آ گئیں نجیب احمد بہت یاد آئے۔

وہ 'بیاض' میں کم کم آنے لگے تھے۔ تشویش ہوتی تھی ان کی خاموش گفتگو کرتی آنکھیں بتاتی بہت کچھ تھیں وہی سچ نکلا جو اندازہ ہوا تھا۔ 'بیاض' کے اس شمارے میں غزل کا ایک شعر ہے جو کتنا حسب حال ہے۔

کسی کی آنکھوں میں کیا جانے کیسا جادو تھا
کہ بھولتا ہی نہیں اب خیال آنکھوں کا

جمیل یوسف

مکرم جناب عمران منظور صاحب۔ سلامت رہیں۔

عموماً وہ شعرا اور شاعرات جن کا کلام بیاض میں شائع ہوتا ہے صرف اپنی نظم یا غزل ہی پڑھتے ہیں دوسرے شعرا کی تخلیقات کی طرف کم ہی متوجہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہم چوں ما دیگرے نیست۔ مگر میں صنفِ غزل کا والہ و شیدا ہوں ہر غزل کا ایک ایک شعر پڑھتا ہوں حالانکہ اکثر غزلوں کے ایک دو شعر ہی پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس بار میں یہ ایک دو شعر نذرِ قارئین کرتا ہوں۔

کوئی بات کو بات نہ جانے
کوئی بال کی کھال ادھیڑے
خالد احمد

غزل کی ایسی بلندی پہ ناز کرتا ہوں
زمین کے شعر سے جب آسمان نکل آئے
آصف ثاقب

بات تو ساری قیمت کی ہے
اچھے اچھے بک جاتے ہیں
امجد اسلام امجد

کوئی بھی راہ سے واقف نہیں ہے
بس اندازے سے چلتے جا رہے تھے
جلیل عالی

میں بھلا دوں اُس کے خیال کو، میں مٹا دوں عکسِ جمال کو
میرے دوستو! یہ بھلا کہاں مرے اختیار کی بات ہے
جمیل یوسف

رنجیدہ و مجبور نہ خود ہو نہ مجھے کر
آغوشِ محبت سے سمانے کے لیے آ

تو حسن ہے میں عشق ہوں، تو عشق ہے میں حسن
ہر فاصلہ، ہر فرق مٹانے کے لیے آ
انور شعور

خرام دیکھ کر کسی کا بحر کھا رہا تھا بل
نکل رہی تھی منہ سے جھاگ ساحلوں پہ لہر کے
راحت سرحدی

کام اتنے اور ایک جانِ عزیز
کیا کرے عمر مختصر میں کوئی
خاور اعجاز

جنھیں ہے آنا، انھیں آنا ہے بہرصورت
پہاڑ چیر کے اُس میں شگاف کرکے بھی
اکرم ناصر

جب بھی پیڑوں پہ بور آتا ہے
نیتوں میں فتور آتا ہے
محمد انیس انصاری

پورا کوئی جب شہر کے معیار پہ اترا
تصویر میں ڈھل کر در و دیوار پہ اترا
گلزار بخاری

اپنی خوشی سے میں نے چنے اپنے راستے
اپنی خوشی سے اپنا زمانہ بنایا ہے
اسلام عظمی

دیکھا تھا تجھے خواب نگر میں کبھی میں نے
رقصاں ہے مرے دل میں وہ تصویر ابھی تک
سید مقبول حسین

یہ میں کیا دیکھتا ہوں خواب آنکھوں میں نہیں ہیں
ترے جانے کا شاید اعتبار آنے لگا ہے
شاہنواز زیدی

کہتے کہتے جو کوئی رُک جائے
لطف دیتی ہے وہ ادھوری بات
حمیرا راحت

کیسے میں اپنی ذات کے اجزا بہم کروں
صحرا میں روح آبلہ پا، جبیل میں بدن
سید قاسم جلال

ہم کو دیوار کے سائے سے نہیں ہے نسبت
ہم جنوں پیشہ تو رہتے ہیں سفر میں اکثر
شوکت محمود شوکت

گزشتگاں سے محبت مجھے بتاتی ہے
میں ایک اور زمانے میں بھی اتارا گیا
قمر رضا شہزاد

چاند کا عکس تھا یا چاند تھا خود پانی میں
مبتلا ہوں میں ابھی تک اسی حیرانی میں
ریاض روحانی

اک پنکھڑی گلاب کی ہونٹوں سے آ لگی
یوں ایک لمس نے مرا مہکا دیا بدن
ارشد محمود ارشد

رائے لوگوں کی اور ہے لیکن
آئینہ اور کچھ بتاتا ہے
نبیل قیصر

اب محبت ہی میرا مسلک ہے
اس کو ایمان کر لیا میں نے
احمد جلیل

نئی زمین ، نیا آسماں بناتے ہوئے
اُجڑ گیا ہوں میں اپنا جہاں بناتے ہوئے
حکیم خان حکیم

یہ ٹوٹا پھوٹا سا کچا مکان رہنے دو
مری زمین مرا آسمان رہنے دو
ظہور چوہان

ہے بارگاہ محبت میں حاضری ہر وقت
نہ کوئی وقفہ ، نہ تعطیل ہے مرے ہم راز

جو سسکاؤ تو لو اور تیزی ہوتی ہے
کشادہ ماتھے میں قندیل ہے مرے ہم راز
اکرم جاذب

شرمندہ ستم پر وہ ستمگار نہیں تھا
دل اپنا بھی کچھ مائل گفتار نہیں تھا
رخشندہ نوید

اُس کے چہرے پہ یوں چمک آئے
جیسے برسات میں دھنک آئے
فرخ رضا ترمذی

میرے اور اُس کے درمیاں رشتہ وبال جان تھا
دل کو سرہانے رکھ دیا ، کمر سے الگ نہیں کیے
ناہید عزمی

شنید ہے کہ وہ ہر بار بچ نکلتا ہے
سو اب کے ہم نے بھی پھینکا ہے جال آنکھوں کا

بس اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گفتگو کر لی
کسی نے دیکھا نہیں ہے کمال آنکھوں کا

وداع ہوتے ہوئے اُس نے اس طرح دیکھا
کبھی بھلا نہ سکوں گی سوال آنکھوں کا

بیان کیسے کروں جو کشش ہے ، آنکھوں میں
خدا کا حسن ہے حسن و جمال آنکھوں کا
رفعت وحید

دل کشی جو عطا ہوئی تجھ کو
شام میں ہے نہ وہ سحر میں ہے

روشنی ہے جو میرے چہرے پر
شمس میں ہے نہ وہ قمر میں
تاثیر نقوی

ملال ہے کہ اب کوئی ملال کیوں نہیں رہا
یہ تو بھی سوچ تو مرا سوال کیوں نہیں رہا

جنوں تمام ہو بے رہروی مکمل ہو
مجھے ملو کہ میر زندگی مکمل ہو
صغیر احمد صغیر

پیاس بجھتی نہیں کسی شے سے
جانے کیا آگ میں نے پی لی ہے
امر مہکی

مشکل پسند ہو گئے جب مشکلیں پڑیں
ہم سے کوئی سوال بھی آساں نہ پوچھئے
وسیم جبران

کچھ روز اگر اور وہ تاخیر سے ملتا
ممکن تھا کہ مجھ سے نہیں ، تصویر سے ملتا
عزم الحسنین عزمی

جن سے گاؤں میں رونقیں تھیں کبھی
اب کہاں پر وہ لوگ بستے ہیں
احمد سجاد بابر

خالق کو کوئی چاک گھمانا نہیں پڑا
کن سے ہے کل جہان کی تعمیر کا سفر
ساجد رضا خان

پرائی جنگ کا ایندھن بنے ہیں
کہاں اپنی لڑائی ہم لڑے ہیں
احمد محمود

اُسی کا حق ہے کہ دیوان اُس کے نام کروں
وہ جس کی یاد میں دن رات شاعری ہوئی ہے
عدنان خالد

اگر ہے حوصلہ اس میں تو چھوڑ جائے مجھے
مرے تو بس میں نہیں وہ ہی یہ کمال کرے
نائلہ راٹھور

وہ بھی دن بھر کا تھکا ہارا مجھے بھول گیا
سو گئی میں بھی کئی خواب سرہانے رکھے
عنبرین خان

ایسا نہیں کہ تم سے محبت نہیں رہی
پہ سے مگر وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی
روبینہ ممتاز روبی

ان ہواؤں کا کیا کروں آیت
تجھ کو لکھتی ہیں آبشاروں پر
آیت آفرین

عشق میں جیتے ہیں مرنے کے لیے
کیا حیات جاودانی اور ہے؟
محمد حماد

میں اپنا حال اُس سے کیا کہوں گا
زیادہ سے زیادہ رو پڑوں گا
کنور افتخار احمد

میں پورے وثوق اور اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دفعہ جملہ غزل میں جو بہترین اور ہر لحاظ سے مکمل شعر تھے وہ میں نے اوپر درج کر دیے ہیں تاکہ شعر و سخن کا ذوق سلیم رکھنے والے لطف اندوز ہو سکیں میں یہ بات بھی بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اوپر درج کیے ہوئے اشعار کے علاوہ باقی و اشعار اکثر غزلوں میں موجود ہیں ان میں اظہار و بیان کا کوئی نہ کوئی نقص اور سقم پایا جاتا ہے۔ ایسے اشعار کو صحیح معنوں میں شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ میں اپنا موقف ایک دو مثالوں سے واضح کرتا ہوں۔ کہیے تو میں بہت سی مثالیں دے سکتا ہوں مگر دل آزاری کے خوف سے صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

زیر نظر شمارے میں سب سے اچھی غزل محترم رفعت وحید کی ہے۔ اسی لیے میں نے اس غزل سے پانچ اچھے اشعار کا انتخاب نذر قارئین کیا ہے مگر اس غزل کے مطلع میں نقص ہے کیونکہ وہ خلاف حقیقت ہے:

پڑا ہوا ہے زمانے میں کال آنکھوں کا
اور اس نے مجھ سے کیا ہے سوال آنکھوں کا

زمانے میں آنکھوں کا کال کہاں پڑا ہوا ہے انسانوں کا جم غفیر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور ہر انسان کی دو آنکھیں ہیں۔ کال کیسا؟ پہلا مصرع یوں ہونا چاہیے تھا:

پڑا ہے کال جہاں میں غزال آنکھوں کا

جناب راحت مرحدی کا شعر ہے:

سمجھ نہ ان کو جھریاں مری جبیں پہ وقت نے
بنا دیے ہیں راستے جو آنسوؤں کی نہر کے

جناب! آنسو جبیں پر نہیں بہتے۔ رخساروں پر بہتے ہیں۔

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب
بہت احترام اور مسنون سلام

"بیاض" کا شمارہ بابت جون 2021 باصرہ نواز ہوا۔ جذبات ممنونیت قبول فرمائیے۔

سب سے پہلے مکتوبات میں سے آصف ثاقب صاحب کے خط کا ذکر کرنا واجب ہے۔

آصف ثاقب صاحب نے جس محبت سے خاکسار کو یاد کیا، میں چاہوں بھی تو الفاظ کے ذریعے اپنے جذبات تشکر بیان نہیں کر سکتا۔ بسا اوقات کوئی بھی زبان ہمارے مافی الضمیر کو کلی طور پر بیان کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔ یہ اُن کی محبت ہے کہ وہ مجھے ہزارے والا سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے کہ میں نے تیس برس ہزارہ کی فضاؤں میں گزارے اور شعری تربیت اچھی بزرگوں کی محافل میں بیٹھ کر حاصل کی ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایبٹ آباد و مانسہرہ کا آسمان صاف شفاف تھا لوگوں اور ٹریفک کے ہجوم نے زمین گدلی نہیں کی تھی۔

بحوالہ مکتوب جمیل یوسف، شفیق سلیمی اور جلیل عالی (برادران) میں کون بڑا شاعر ہے، اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔ اپنی زبانی خود کو بڑا شاعر کہنا کسی کو زیبا نہیں۔ یہ تو مریضانہ تعلّی ہے۔

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

شفیق سلیمی کا ایک شعر جو نہ صرف میری سماعتوں میں گونجتا ہے۔ بلکہ ادبی حلقوں میں بھی، ان کی شعری عظمت کا گواہ ہے:

بے نام دیاروں کا سفر کیسا لگا ہے — اب لوٹ کے آئے ہو تو گھر کیسا لگا ہے

شعرِ امروز کے حوالے سے شاہد ماکلی نے دو شعراء سے متعارف کروا کر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچائی کہ جوہر قابل صرف شہروں میں ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جوہر قابل نہ کسی علاقے کی میراث ہے اور نہ کسی خاندان کی۔ پھول یہ نہیں سوچتا کہ وہ باغ میں کھل رہا ہے یا ویرانے میں۔ آج کا نوجوان بلکہ مضافاتی نوجوان بہت اچھا شعر کہہ رہا ہے۔ اس کے ہاں ندرتِ خیالات کے ساتھ ساتھ جدید لہجہ و اسلوب نے جگہ بنائی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ادبی دنیا پر اجارہ داری کی وجہ سے جوہر قابل اپنے حسنِ کلام کی داد سے محروم ہے۔ غزل کا گوشہ ہمیشہ کی طرح تروتازہ تھا۔ جمیل یوسف صاحب کی غزل روایت کے رس میں رچی ہوتی ہے آج جب کہ نئے نئے تجربوں نے روایتی غزل کے حسن کو گدلا دیا ہے۔ جمیل یوسف صاحب نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔

زیرِ نظر پرچہ میں ان کی غزل کا یہ شعر بہت پسند آیا۔

یہ خیال و خواب کی جنتیں، یہ فسونِ شوق کی ساعتیں — تری دید کی ہیں بشارتیں، ترے انتظار کی بات ہے

جلیل عالی صاحب کی غزل بھی پسند آئی۔ جلیل عالی کی غزل عمومی طور پر سیاسی ابتری اور بداعمالیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زبوں حالی کا نوحہ ہوا کرتی ہے۔ زیرِ نظر غزل کے چھٹے شعر کا پہلا مصرع یوں طبع ہوا ہے۔

یہ کس کا غم قیامت رو رہی ہے

مجھ کم فہم کی جسارت دیکھیے کہ میں جلیل عالی صاحب جیسے مسلم الثبوت شاعر سے سوال کر رہا ہوں کہ کیا "غم رونا" اردو محاورہ کے مطابق ہے۔ "غم اٹھانا"۔ "غم کھانا" تو سنتے آئے ہیں۔ یہ غم رونا کون سی لغت میں ہے چند اشعار جو بہت پسند آئے:

یہ کس نے خال و خد بدلے ہمارے
ہم اپنے آپ پر جانے لگے تھے
جلیل عالی

غموں کو راز میں رکھنا محال ہے ثاقب
جو زخم باندھ کے رکھوں دھواں نکل آئے
آصف ثاقب

چھلک پڑے ہیں وہیں ساغر و سبو سارے
جہاں بھی آیا ہے، مجھ کو خیال آنکھوں کا
رفعت وحید

میرے اور اس کے درمیان رشتہ وبالِ جان تھا
دل کو سرہانے رکھ دیا، کمرے الگ نہیں کیے
ناہید عزمی

گزشتگاں سے محبت مجھے بتاتی ہے
میں ایک اور زمانے میں بھی اتارا گیا
قمر رضا شہزاد

نہیں غرض پھول پھل سے تازہ مزاج کو بس
شجر کو لکڑی میں ڈھالنے کی پڑی ہوئی ہے
خاور اعجاز

دیگر مندرجات بھی لائقِ مطالعہ تھے۔ سب پر بات کرنا خط کی طوالت کا سبب ہوگا۔ ایک غزل 'بیاض' کی نذر کر رہا ہوں۔

والسلام

ثاقب تبسم ثاقب

محترم جناب عمران منظور و اعجاز رضوی!

السلام علیکم!! "بیاض" پورے اہتمام کے ساتھ علم و ادب کے چاہنے والوں کی پیاس بجھا رہا ہے۔ اس میں شائع ہونے والی نگارشات یقیناً معیاری ہوتی ہیں اور اسی معیار کو برقرار رکھنے کے لیے اس کی جدوجہد اور سفر جاری ہے۔ مئی کے شمارے میں بھی نظم و نثر کا عمدہ انتخاب پڑھنے کو ملا۔ حمد و نعت کے سرمایۂ عظیم نے قلب و ذہن معطر کر دیے۔ حمد و نعت کے اشعار میں بہتر اور بہترین کا پیمانہ میرے پاس نہیں کیونکہ ایسے اشعار جن میں اللہ تعالیٰ اور نبی پاکؐ کا ذکرِ مبارک پاکیزہ نیت اور سچی عقیدت سے کیا جائے، وہ بہترین سے پیچھے ہو ہی نہیں سکتے۔ جناب خاور اعجاز کے قطعات سوز و گداز سے بھرے پڑے تھے اور ان میں تصوف کی آمیزش نے انھیں اور بھی موثر بنا دیا۔ جناب ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار کا تصوف پر مضمون "حاصل اور محرومی" خاصے کی شے تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا قلم تصوف کے تمام رموز و اوقاف سے بخوبی آشنا ہے اور ان کا اسلوب قلم کی روانی کا بہترین معاون ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے زندگی اور اس کے لوازمات کو ایک فقیر کی آنکھ سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تخلیق فکری اعتبار سے تو اہم ہے ہی، فنی حوالے سے بھی اس کے محاسن خوب ہیں۔ سادگی و سلاست اور اختصار ایسی خوبیوں سے اس مضمون کی اثر آفرینی میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے۔ جناب نجیب احمد پر جناب سید ریاض حسین زیدی کا مختصر اظہاریہ اچھا خراجِ تحسین تھا۔ جناب حامد یزدانی کی یادداشتیں بھی دل کو چھو گئیں۔ رفتگاں سے محبت کا ہر اظہار سکونِ قلب کا باعث ہوتا ہے۔ افسانوں کی دوڑ میں پیروز بخت قاضی کے "خواب اور حقیقت" اور کلیم خارجی کا "قطار ٹوٹتی ہے" اچھے لگے۔ لیکن ایک افسانہ ایسا تھا جس نے جکڑ لیا تھا۔ وہ افسانہ جناب جمیل احمد عدیل کا "انٹرن شپ" تھا۔ ایک نئے موضوع پر اچھوتے انداز میں لکھا جانے والا یہ افسانہ دل کو بھا گیا۔ جناب جمیل احمد عدیل ایک منجھے ہوئے قلمکار ہیں اور اس افسانے میں ان کی مہارت عیاں ہے۔ عدیل صاحب کے جملوں کی تخلیقیت اپنی مثال آپ ہے۔ غزلیات کا انتخاب بھی حسبِ معمول باذوق تھا۔ آصف ثاقب، جمیل یوسف، جلیل عالی، انعام الحق جاوید، گلزار بخاری، منظور ثاقب، اقبال سروبہ، عزیز عادل، ڈاکٹر اشفاق ناصر، آفتاب خان اور اسد اعوان کی غزلیں زیادہ پسند آئیں۔ ممتاز مفتی پر جناب محمد حنیف پر مضمون دلچسپ تھا۔ سیدہ آیت گیلانی کا جناب خالد احمد کے نعتیہ مجموعے "تشبیب" کا فکری مطالعہ کا یہ حصہ اچھا لگا۔ آئندہ حصے کا انتظار رہے گا۔ شاہدہ دلاور شاہ نے "مکئی میں مرگ" پر تبصرہ لکھتے ہوئے حق ادا کیا۔ سیدہ آمنہ ریاض اور نور کمال شاہ کے مزاحیہ اور طنزیہ مضامین بہت دلچسپ تھے۔ جناب امجد اسلام امجد کی نظم "لاک ڈاؤن"

بہت زبردست تھی جبکہ جناب کرامت بخاری کی نظم "دل" بھی اچھی لگی۔ جناب امین کھچی کی نظم سادہ تھی اور یہی اس کی خوبی تھی کہ اپنی سادگی سے نظم نے دل میں گدگدی کی۔ جناب سرور حسین نقشبندی کی نظم "اس قوم کی بیٹی" ایک جذباتی نظم تھی جس میں حقیقت کو گمان اور گمان کو حقیقت کا روپ دیا گیا تھا۔ ایک نازک اور حساس موضوع پر فکر انگیز نظم تھی۔ یہ شمارہ لائبریری میں خوبصورت اضافہ ہے۔ والسلام! دعاگو!!

رانا محمد شاہد

جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم!

جون کا بیاض، خالد احمد کے دلکش سرورق کے ساتھ ملا۔ ملکی حالات اور عوام کی تسلی اس جملے سے کی جاسکتی ہے کہ "وقت جیسا بھی ہے، گزر جائے گا"۔ مگر خالد احمد کی غزل کے اس شعر کی صورت ڈھل جائیں گے تو زیادہ اچھا ہے۔

زخم بھر جائیں گے ، دن گزر جائیں گے ،عمر کی طرح ڈھلتے رہو
رات ڈھل جائے گی ،رُت بدل جائے گی، وقت کے ساتھ چلتے رہو

اس دفعہ کتابوں کے جو ٹکڑے دیئے گئے ہیں۔ ان میں بشریٰ رحمٰن صاحبہ کی کتاب "لکھی کو کون موڑے؟" بھی ہے۔ یہ ان کی آپ بیتی ہے۔ اس کتاب کے حوالے سے میں نے دو تین کالم نگاروں کے تاثرات پڑھے، جن سے اندازہ ہوا کہ اس میں پاکستان کی سیاسی تاریخ اور عبرت کی داستانیں دفن ہیں۔ سیاست مفادات کا عجیب گورکھ دھندا ہے۔ بشریٰ صاحبہ نے اس کتاب میں سیاسی منافقتوں کو خوب عیاں کیا ہے۔

سلیمان عبداللہ ڈار کی روح کو آسودگی دیتی تحریریں نظر سے گزرتی رہتی ہیں۔ خوشی ہے کہ وہ "بیاض" کے لیے بھی باقاعدہ لکھ رہے ہیں۔ شاہد مانکی نے دو نوجوان شاعروں ظہور منہاس اور عادل گوہر کی شاعری پر تحریریں لکھیں۔ 'بیاض' تو ہمیشہ سے نوجوان لکھنے والوں کے لیے ایک بہترین پلیٹ فارم رہا ہے اور یہ حوصلہ افزائی ہی ہے جو لکھنے والوں کو آگے بڑھنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔

سلمیٰ اعوان صاحبہ کا مضمون پڑھتے ہوئے بچپن کے کئی رنگ سامنے آگئے۔ جب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی نظمیں شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ ان دنوں کراچی سے بچوں کا ایک رسالہ "نوٹ بوٹ" کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس کے کئی شمارے اب بھی محفوظ ہوں گے۔

حبیب الرحمٰن، انعام الحسن کاشمیری، محمد علی، شکیل احمد خاں اور امین کھچی کے افسانے پسند آئے۔ محمد شعیب مرزا کی تحریر "اچانک اس پر گھبراہٹ اور منشی....." کی جگہ میرے خیال میں افسانوں میں بنتی تھی۔ "نیش عشق" افسانوی مجموعے اور "قیدی" دہشت گردوں پر لکھی گئی کہانیوں کی کتابوں پر تبصرے بھی اچھے لگے۔ حمزہ حسن شیخ نے "قیدی" میں جدید اور منفرد موضوعات پر کہانیاں لکھیں۔ یقیناً ناقدین کو بھی منفرد عنوانات کے ساتھ لکھے گئے یا فسانے پسند آئیں گے۔

والسلام

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم
ماہ جون کا شمارہ ملا۔ حسب سابق غزلوں نظموں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے۔
آغاز میں جناب خالد احمد کی غزل نے در کھولتی ہے۔ مطلع تو خوب ہے:

زخم بھر جائیں گے، دن گزر جائیں گے، عمر کی طرح ڈھلتے رہو
رات ڈھل جائے گی، رُت بدل جائے گی، وقت کے ساتھ چلتے رہو

حالات کیسے بھی ہوں ہم نے اپنا سفر جاری رکھنا ہے یہی زندگی ہے۔

نسیم سحر کا حمدیہ شعر ملاحظہ کیجئے:

ابجد کے سب حروف میں دیوان حمد ہے — تاہاں ہر ایک حرف میں عنوانِ نعت ہے

نعت کے حوالے سے جناب جلیل عالی کا شعر ہمیں سیرت طیبہ پہ عمل پیرا ہونے کا درس دیتا ہے:

تیری سیرت سے جسے پیار نہیں — وہ کبھی صاحبِ کردار نہیں ہو سکتا

غزل کے حوالے سے کئی اشعار قابل ذکر ہیں۔ خاور اعجاز کا شعر موجودہ دور کے رویوں کی عکاسی کرتا ہے

یہ کھیل بستی میں کیسا مقبول ہو رہا ہے — ہر اک کو گڑیا اچھالنے کی پڑی ہوئی ہے

ضروری نہیں کہ تجربے کے ساتھ ساتھ شعور بھی آئے مگر اپنے اپنے تجربے کی بات ہے صاحب۔

تجربہ اک عمر مانگتا ہے — رفتہ رفتہ شعور آتا ہے

محمد انیس انصاری

گلزار بخاری اپنے اسلوب اور لہجے کے شاعر ہیں۔

پورا کوئی جب شہر کے معیار پہ اترا — تصویر میں ڈھل کر درو دیوار پہ اترا

گلزار بخاری

کیا زبردست سیاسی، انتخابی دنوں کی عکاسی کرتا ہوا اشتہاری شعر ہے۔ اسے میں نے اپنی کتاب میں مابعد جدید غزل کے باب میں بھی شامل کر لیا ہے۔ بات نہ بڑھانے کا تہیہ کرتے ہوئے حمیرا راحت کا شعر خوب ہے:

اب تو بس خامشی ہی بہتر ہے — اب بڑھاوے گی اور دوری بات

حمیرا راحت

سید قاسم جلال کی ردیف جھیل میں بدن نے پن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اور جواری کے ہاتھ کا سکہ کی ترکیب کے ساتھ قمر رضا شہزاد کی غزل بہت عمدہ ہے:

مجھے سمجھیے جواری کے ہاتھ کا سکہ — میں جیتنے کے لیے بار بار لایا گیا

قمر رضا شہزاد

موجودہ وبا کے دور کی عکاسی کے حوالے سے ارشد شاہین کا شعر خوب ہے:

توڑ لیتی ہے وبا روز کوئی پھول اور ہم — تکتے رہ جاتے ہیں بس دستِ اجل کی جانب

ارشد شاہین

گلزار بخاری، کرامت بخاری، خاور اعجاز، طالب انصاری، امین کھجاہی، زبیر فاروق، اظہر عباس، رخسانہ سمن، رخشندہ نوید، وغیرہ سب کی نظمیں اپنے اپنے موضوع کی مناسبت سے خوب ہیں۔ شعرا اور بھی اچھے ہیں نظموں، مضامین، خطوط اور آپ بیتی کے حوالے سے بھی تبصرہ تفصیلی وقت مانگتا ہے۔ خط کو خط ہی رہنے دیتا ہوں مضمون نہیں بناتا۔ بیاض کی وساطت سے ہم ادب کی رفتار سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں۔ دوستوں سے آدھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ دعا ہے کہ آپ اسی طرح بیاض کے شمارے ترتیب دیتے رہیں کشتِ ادب کی آبیاری کرتے ہیں۔ آمین

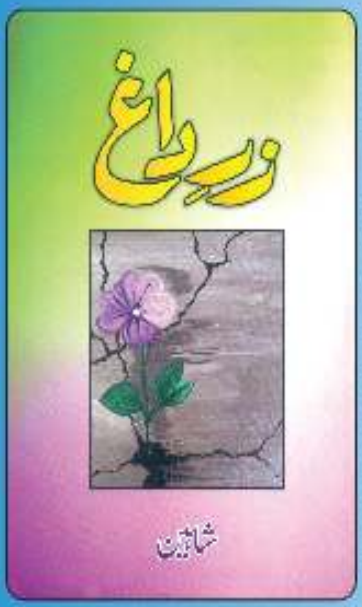

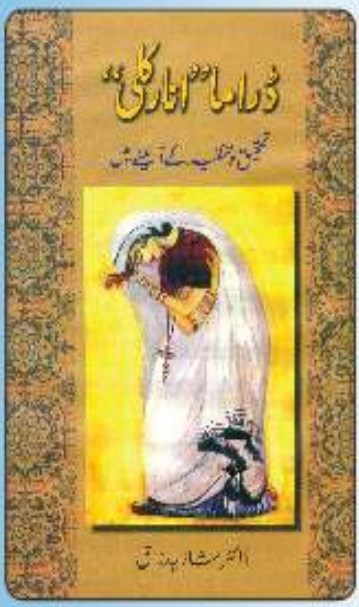

ڈراما "انارکلی"

شاہین

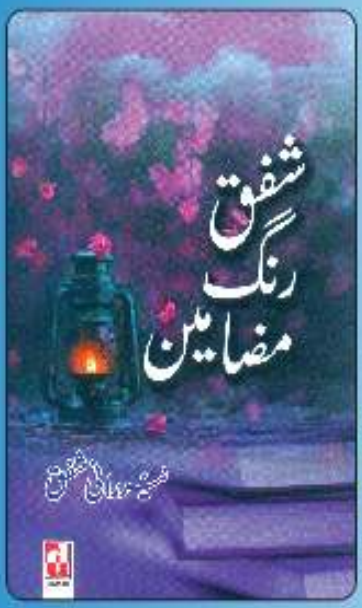

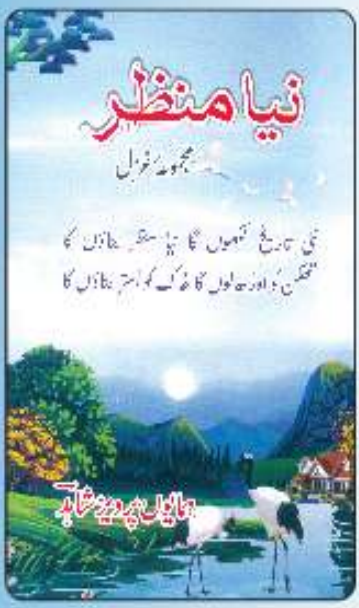

نیا منظر
مجموعۂ غزل

شفق
رنگ
مضامین

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888